نیا دور
ضمیمہ اودھ
جون سنہ ۱۹۹۴ء
تین روپے

ریاست کے گورنر
شری موتی لال وورا
راج بھون کے
تلک ہال میں منعقدہ
ایک جلسہ میں
"مینول آف یوگ"
کا رسم اجراء
کرتے ہوئے

وزیر اعلا اترپردیش شری مُلائم سنگھ یادو
اپنی حکومت کے چھ ماہ مکمّل ہونے پر پریس کانفرنس کو
خطاب کرتے ہوئے۔

نیا دور

جلد ۴۹ — نمبر ۳

جون ۱۹۹۴ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

فون نمبر ۲۴۵۶۶۰

معاونین

محمد الیاس خاں۔ مبین احمد صدیقی

پبلشر

اتل بگائی

(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ

یونائٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

زر سالانہ: تیس روپے

عام شمارہ: تین روپے

ترسیل زر کا پتہ

سپرنٹنڈنٹ پرکاشن بربھاگ

انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، اترپردیش لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

اترپردیش، لکھنؤ

سرورق: ابوالفضل

کتابت و تزئین: حسن اختر

ضمیمہ اودھ

عنوانات

(سرورق کی تصویر: واجد علی شاہ)

اپنی بات

اودھ نمبر کی مقبولیت اور علمی، ادبی حلقوں میں اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم یادگار حیثیت کا مالک ہے۔ جس طرح اس کی حوصلہ افزائی کی گئی اُس کا ادارہ کے اوپر گہرا اثر ہے۔

اس تاریخی، علمی اور ادبی دستاویز کی تیاری میں اہلِ علم نے جس طرح تعاون فرمایا اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اپریل اور مئی کے شماروں میں بھی اور زیرِ نظر شمارہ میں بھی اودھ سے متعلق بے حد اہم، قیمتی علمی اور ادبی مضامین کا تسلسل برقرار ہے۔ یہ مضامین یقیناً بہت اہم تھے لیکن صفحات کی تنگ دامنی کی بنا پر اودھ نمبر میں جگہ نہ پا سکے۔ بعد کے تینوں شماروں کو اودھ سے متعلق مضامین کی شمولیت کی بنا پر اودھ نمبر کا ضمیمہ ہی تصور کیا جانا چاہیے۔

ہمارے وطن کی تاریخ میں اودھ نے جس طرح اپنا کردار ادا کیا ہے وہ ہماری سنہری روایات کا روشن ترین حصہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ عالمی تہذیب کا کوئی تصور ہندستان کے بغیر نامکمل، ادھورا اور کسی حد تک معنویت سے خالی ہے اور ہندستان کا دل اتر پردیش ہے۔ اس طرح رود گنگ وجمن سے اُٹھنے والی ہوائیں اور سرجو اور گومتی کے ساحل دراصل تہذیب کے نشریاتی مراکز ہیں جنھوں نے سارے عالم تک اپنی روشنی بکھیر دی ہے۔ اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ اس تہذیب کی جتنی جہتیں اور جتنے روشن نقوش ہیں ان سب کو اُجاگر کیا جا سکے۔ اس لیے اودھ نمبر کے سہارے پورے اتر پردیش بلکہ یوں کہیے کہ پورے ہندستان کی ان روایات اور اس تاریخ کو پیش کیا گیا تھا، جس سے عالمی تہذیب نے فائدہ اُٹھایا تھا اور مغرب کے "صاحب لوگوں" نے خود لکھنؤ میں بیٹھ کر اور کلکتہ کے مٹیا برج میں جاکر، ارکاٹ اور حیدر آباد میں اسی تہذیب کے عکس دیکھ کر لباس کی تراش خراش سے لے کر نفاست اور آرائش کے بہت سے اصول سیکھے، انھیں برتا اور انھیں اپنی تہذیب کا جز بنایا۔

جغرافیائی نقشہ بدلتا رہتا ہے۔ کل تک کوئی ملک وجود نہیں رکھتا تھا، آج وہ ایک آزاد ملک کی حیثیت سے عالمی نقشہ پر ابھر آیا۔ حال ہی میں جنوبی افریقہ اور ارضِ فلسطین کے نئے ممالک وجود میں آئے۔ اس طرح پہلے یورپ میں پھر ایشیا میں سیاست نے نئی جغرافیائی حد بندیاں قائم کی ہیں۔ اس طرح جغرافیہ بدلتا رہتا ہے۔ زمین پر سیاسی لکیریں کھینچ کر انھیں تقسیم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن تہذیب اور تاریخ کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا، وہ ایک ناقابلِ تقسیم وراثت ہے۔ اسی لیے برصغیر میں بہت سی لکیریں کھنچیں، لیکن اتر پردیش کی تہذیب کے روشن نقوش پشاور سے ڈھاکہ تک آج بھی اٹل سچائی کی طرح موجود ہیں۔

اِسی تہذیب کا ایک رُخ محرم منانے اور عزاداری کے مراسم تھے جس نے آج جغرافیائی دیواروں کو گرادیا ہے۔ یہ اسی تہذیب کی روشنی ہے جو ہر جگہ پھیلی ہے اور آج ہر جگہ محرم احترام اور عقیدت سے منایا جاتا ہے اور ہر طبقۂ خیال اپنے اپنے انداز سے امام حسینؑ اور شہیدانِ کربلا کی یادگار مناتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے تقریباً نصف صدی سے قبل کہا تھا ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو! ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

جب بھی انسانی تاریخ پر کوئی بُرا وقت پڑتا ہے یا بُرا وقت پڑے گا بے اختیار زبان سے نکلتا ہے اور نکلتا رہے گا ؎

اے زندگی جلالِ شہِ مشرقین دے اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسینؑ دے

ایڈیٹر

حسینی ضابطے جینے کا اک دستور دیتے ہیں

حسینیت شعورِ زندگی، رمزِ خود آگاہی
حسینیت متاعِ حریت، شانِ یداللٰہی
حسینیت غرورِ تشنگی، تہذیبِ دانائی
حسینیت حدیثِ درد، ذوقِ آبلہ پائی
حسینیت بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کی صف بندی
حسینیت ہجومِ دشمناں میں حوصلہ مندی
حسینیت علائم، معنویت کا رواں دریا
حسینیت کرم، لطف و نوازش، خیر کی دنیا
حسینیت ہی رنگِ جاوداں افکارِ دینی کا
حسینیت ہی پرتو رحمۃ للعالمینی کا
حسینیت دکھی انسانیت کی فصلِ غم خواری
حسینیت شبِ دیجور میں پیغامِ بیداری
حسینیت رفیقِ اضطرابِ دل، سکونِ جاں
حسینیت کی حد میں آکے ساری مشکلیں آساں
حسینیت ہمیشہ ہم سبھی کے کام آئے گی
اسی کے نام آئے گی جو صبح و شام آئے گی

حسینی ضابطے فکر و نظر کو نور دیتے ہیں
حسینی ضابطے جینے کا اک دستور دیتے ہیں

حسینؑ اک درس دیتے ہیں بہیمیت کے نرغے میں
مقاصد روشنی پاتے ہیں تلواروں کے سائے میں
جہاں میں جب کبھی بے ضابطگی کا دور آئے گا
حسینیت کا مقصد ہی فضا میں جگمگائے گا
اندھیرا عارضِ اقبال پا کر جب بھی چمکے گا
حسینی عزم پھر رنگِ شفق سے مسکرا دے گا
ستم سے، شیطنت سے، سرکشی سے دب نہیں سکتی
حسینیت زمانے میں کسی سے دب نہیں سکتی

حسینی قافلہ صبر و رضا کا قافلہ ٹھہرا
یہ حد ہے چھ مہینے والا بھی باحوصلہ ٹھہرا
حسینی قافلے والوں میں جینے کی ادا دیکھی
بہ پاسِ شکرِ مولا خشک ہونٹوں پر دعا دیکھی
سلام ان پر اجالا جن کے چہروں پر رہا رقصاں
سلام ان پر جو ہیں تاریخِ عالم کا جلی عنواں
سلام ان پر جنھوں نے روح کو تابندگی بخشی
سلام ان پر جنھوں نے چشمِ تر کو روشنی بخشی

□□

رباب رشیدی
۱۲۶۔ تازی خانہ، لکھنؤ

شارب رُدولوی

پروفیسر اُردو - جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

لکھنؤ کی تہذیب کا آخری نمائندہ شاعر

آثر لکھنوی

نواب جعفر علی خاں آثر لکھنوی نہ صرف یہ کہ اُردو کے ایک اہم اور بلند پایہ شاعر تھے بلکہ لکھنؤ کی تہذیب، رواداری، نفاست وضعداری، آداب اور زبان میں ایک روایت کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ دبستانِ لکھنؤ کی صحت مند شعری روایت کے آخری نمائندہ شاعر تھے۔ جن سے اُردو شعراء کی کئی نسلوں نے ذہنی و فکری تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اُردو کے ایک اچھے نقاد اور نثر نگار بھی تھے۔ لکھنؤ کی زبان اور تہذیب، شائستگی اور نفاست یا اُردو شاعری کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

آثر لکھنوی ۱۲؍جولائی ۱۸۸۵ء یعنی ۱۰۹ سال پہلے کٹرہ ابو تراب خاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہ لکھنؤ کی آخری بہار تھے۔ زمانہ بہت بدل چکا تھا، انتزاعِ سلطنتِ اودھ کو تقریباً تین دہائیاں گزر چکی تھیں اور ایک نیا سرمایہ دارانہ نظام، نئی تہذیب اور زبان کے ساتھ پورے ملک میں اپنے قدم مضبوط کر چکا تھا۔ دہلی کی تہذیبی شناخت مدھم پڑنے لگی تھی لیکن اودھ میں یہ چراغ ابھی مخالف ہواؤں کی تیزی و تندی کے باوجود روشن تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ یہاں کی تہذیب صرف ایک شہر تک محدود نہیں تھی بلکہ تہذیب کے اس درخت کی جڑیں دُور دُور تک اودھ کے چھوٹے چھوٹے قصبات میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اثر صاحب کہا کرتے تھے:

> "میاں رُدولی، دریاآباد، سندیلہ، کاکوری، محمود آباد
> اَودھ کے قصبات نہیں لکھنؤ کے محلے ہیں اور لکھنؤ
> کی تہذیب انھیں سے زندہ ہے۔"

آثر لکھنوی اسی تہذیب کی نرمی، نفاست، شائستگی، حسنِ اخلاق، علم دوستی، ادب نوازی، رواداری، زبان و آداب، وضع داری اور دلکشی کی جیتی جاگتی مجسّم تصویر تھے۔

آثر لکھنوی نے طویل عمر پائی۔ ڈپٹی کلکٹر سے لے کر کشمیر کے وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اعظم تک کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۸۲ سال کی عمر میں ۶؍جون ۱۹۶۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اس عرصہ میں انھوں نے زندگی، ادب اور تہذیب کے افق پر بہت کچھ بنتے، ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کٹرہ ابو تراب خاں، پاٹا نالہ، فرنگی محل، کشمیری محلہ جلیل القدر علماء مجتہدین اور شعراء سے چھلک رہا تھا۔ ہر طرف علم و ادب کا چرچا تھا آثر لکھنوی نے اسی علمی و ادبی ماحول میں ایک رئیس، باوقار اور ذی علم خانوادے میں آنکھ کھولی، یہ ایک ایسا خاندان تھا جہاں دولت کی بھی فراوانی تھی اور علم کی بھی۔ اثر نے مشرقی روایات، زبان اور تہذیب کی وراثت اپنے خاندان سے پائی اور جدید تعلیم اسکول اور کالج سے حاصل کی۔ مغربی علم، لباس اور تہذیب کو انھوں نے کارِ دُنیا کے لیے ہی رکھا۔ وہ کبھی ان کی زندگی کا حصّہ نہیں بن پائی۔ لیکن لکھنؤ کی تہذیب ان کی زندگی تھی۔ لکھنؤ کا یہ زمانہ شعر و ادب کے لحاظ سے بہت اہم زمانہ تھا۔ اثر نے جس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی عزیز لکھنوی اور آرزو لکھنوی کے نام افقِ شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ عزیز لکھنوی سے انھوں نے مشورۂ سخن کیا۔ یہ زمانہ لکھنؤ کی شاعری کا اہم زمانہ ہے۔ یہ دبستانِ لکھنؤ کی شناخت بھی ہے اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب بھی ہے۔ اس عہد کے بغیر لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ زبان اور خیال آرائی کے ساتھ فکر کی گہرائی اور

جذبے کی تصویر کشی کا زمانہ ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس عہد کی شاعری کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ورنہ ناقدین کو دبستانِ لکھنؤ کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی پڑتی۔ اصل میں ایک مشکل یہ ہوتی ہے کہ کسی عہد کے بارے میں اگر کوئی بات کہہ دی گئی تو وہ تاریخ بن جاتی ہے۔ حالاں کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ فکر و اظہار کے زاویے بدلتے ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ امانت اور خواجہ وزیر کے عہد کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ اصطلاحات اس طرح تنقید میں چل پڑیں کہ حالات بدلے، فکر و اظہار کے انداز تبدیل ہوئے لیکن اعتراض اسی طرح باقی رہا۔ حالاں کہ اس عہد کی شاعری اگر دیکھیں تو دبستانِ لکھنؤ کی ایک نئی صورت نظر آئے گی۔ ثاقب لکھنوی کا یہ شعر صرف توجہ دلانے کے لئے پیش ہے ؎

قفس مجھ کو نشیمن ہو گیا خوفِ اسیری سے
کوئی پتا کھڑکتا ہے تو پہروں دل دھڑکتا ہے

قفس اور نشیمن، باغباں اور چمن کہنے کو تو قدیم علامات اور اشارے ہیں لیکن یہ کس معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور عصری حسیت کے کس پہلو کو پیش کرتے ہیں اس کی طرف توجہ نہ دینا ناانصافی ہے۔ اس کے علاوہ یہ عہد ان سماجی تبدیلیوں کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے، جو لفظی بازیگری اور قافیہ پیمائی کی شاعری کو عصری فکر کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہی تبدیل ہوتی ہوئی فضا تھی جس میں اثر لکھنوی کی شاعری کی نشو و نما ہوئی۔ اثر کی نگاہ بدلتے ہوئے حالات پر بھی تھی اور لکھنؤ کی تہذیبی اقدار پر بھی۔ اثر کی شاعری کے یہی دو اہم عناصر ہیں۔

لکھنؤ کی تہذیب اکثر اُن لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتی ہے جنھوں نے اس کے بارے میں سنا ہے یا اِدھر اُدھر کے غیر ذمہ دارانہ تبصرے پڑھے ہیں۔ مثلاً اس طرح کی باتیں بہت سے لوگوں نے لکھی ہیں کہ:

"دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں بھرتی کے مضامین، لکھنؤ کی نسائیت، فارسی کی دلآویز تراکیب کی کمی، خارجی مضامین کی زیادتی داخلی اور رومانی مضامین کا فقدان، تصوف کا فقدان، رعایتِ لفظی کا شوق، معاملہ بندی، ابتذال اور رکاکت، بیہودہ اور مبتذل تشبیہات و استعارات کا استعمال"۔[1]

اور جب کسی نے لکھنؤ کی شاعری کا ذکر کیا تو یہی اعتراضات دُہرا دیے۔ سوال یہ ہے کہ کس لکھنؤ کا ذکر ہے۔ کیا لکھنؤ اور دبستانِ لکھنؤ آصف الدولہ سے لے کر دولتِ انگلشیہ کا صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کا مرکز بننے کے بعد تک ایک ہی رہا۔ "لکھنؤ" کی شاعری کا ایک عہد رعایتِ لفظی اور معاملہ بندی کا عہد ضرور رہا ہے۔ اس فکر کے ذمہ دار اس زمانے کے سیاسی و سماجی حالات تھے اور اس طرح کے حالات جہاں بھی جب کبھی پیدا ہوئے ہیں شعر و ادب میں اس طرح کی باتیں آئی ہیں۔ دہلی میں ایک پورا عہد ایہام گوئی اور اس کے بعد رعایتِ لفظی اور معاملہ بندی کا رہا ہے جس سے بہادر شاہ ظفر اور امیر مینائی جیسے شاعر بھی نہیں بچ سکے۔ لیکن وہاں اس عہد کی عمر اس لیے مختصر رہی کہ دہلی اُجڑ گئی۔ اہلِ علم، اہلِ حرفہ جہاں سکون و تحفظ تھا، عزت و نیک نامی تھی وہاں چلے گئے۔ لکھنؤ اس وقت سب سے زیادہ امن کی جگہ تھی، دولت کی فراوانی تھی، شعر و ادب کی سرپرستی کرنے والے تھے، یہاں پہنچ کر ان اساتذہ نے اس لذت اندوزی اور لفظی بازی گری کو اور ہوا دی۔ بہر حال اس کا سبب کچھ بھی ہو، کوئی بھی تحریک یا انداز ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ فکر، اظہار یہاں تک کہ ہیئت کے سانچے سب، وقت اور سماجی تبدیلیوں یا سماجی مطالبات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اٹھارھویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے اس تبدیلی کو لکھنؤ کی شاعری میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر وقت کے ساتھ تبدیلی کی یہ رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ ثاقب، عزیز، صفی اور آرزو کے یہاں تبدیلی نمایاں ضرور ہے۔ خاص طور پر ثاقب کے یہاں فکر کی جو گہرائی اور احساس کی جو شدت ہے وہ ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نہیں ہے۔ لیکن یہ تبدیلی اثر کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

اثر کی شاعری میں کسی طرح کی شدت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ان کی شاعری کی کمی ہو۔ لیکن لکھنؤ کی تہذیب کی خصوصیت ہی نرمی، نفاست اور سکون ہے۔ یہاں تیز تیز چلنا، تیز آواز میں بولنا بدتمیزی میں شامل ہے۔ یہاں کی تہذیب ٹھمری، دادرا اور خیال میں ہے۔ یہاں کی تہذیب کتھک میں ہے، یہاں کی تہذیب غزل میں ہے۔

اثر کی شاعری اسی تہذیب کی نرمی، نفاست اور سلیقے کی تصویر ہے۔ اثر کی زندگی میں بھی ایک سلیقہ، نفاست اور سکون ہے اور ان کی

شاعری میں بھی۔ ان کے یہاں تفکر کی گہرائی کا اظہار بھی سادگی اور شگفتگی
کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی زبان میں کوئی پیچیدگی، ابہام اور الجھاؤ
نہیں ہے، یہی ان کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ ان کے چند اشعار
ملاحظہ ہوں ؎

مجھ سے روشن ہے شمع دیر و حرم
کبھی آزر، کبھی خلیل ہوں میں

کون ہوں، کیا ہوں اور کیوں ہوں میں
عاجز ادراک و ہوش ہے مجھ سے

خدا معلوم ہستی کیا ہے، کیا ہے راز ہستی کا
جہاں تک شرح کرتے جاؤ مبہم ہوتی جاتی ہے

اثر کے ان اشعار میں جو فکری گہرائی ہے اور ایسے فلسفیانہ اور متصوفانہ
موضوعات کو جس سلاست اور صفائی کے ساتھ وہ نظم کر دیتے ہیں یہ
انہیں کا حصہ ہے۔ خدا، انسان، ازل و ابد، دنیا، حیات اور موت ایسے
موضوعات ہیں، جن پر اردو شعراء نے اکثر اظہار خیال کیا ہے لیکن
اثر نے جس طرح اسے نظم کیا ہے اس میں نہ کسی طرح کی پیچیدگی ہے نہ
الجھاؤ ہے نہ فلسفیانہ موشگافی ہے۔ "موت سے چند چرائے ہوئے لمحے
ہیں کہ زیست" زندگی پر اتنے سادہ اور دلکش انداز میں تبصرہ مشکل ہی سے
کسی شاعر کے یہاں نظر آئے گا۔ اظہار و بیان میں یہی سادگی ان کی خصوصیت
ہے۔ دراصل لکھنؤ کی تہذیب ان کی شاعری میں زندہ، متحرک اور بولتی
ہوئی نظر آتی ہے جس میں کچھ سکوت ہے، کچھ حجاب ہے، جہاں تہذیب
مجلس نہ بولنے دیتی ہے اور نہ نظر بھر کر دیکھنے دیتی ہے۔ بس ایک
کسک ہے جو بیان نہیں کی جا سکتی، محسوس کی جا سکتی ہے ؎

لب پہ آیا نہ اس کا نام کبھی
غم کی پرہیزگاریاں نہ گئیں

سخن نہ آشنا رکھا کسی کی بزم میں مجھ کو
کبھی تہذیب مجلس نے کبھی ترتیب مجلس نے

اس تہذیب مجلس اور ترتیب مجلس کا لطف کوئی لکھنؤ تہذیب آشنا
ہی لے سکتا ہے۔ اثر تو حرف تمنا بھی لب پر نہیں لاتے کہ یہ تہذیب عشق
اور آداب محبت کے خلاف ہے۔ یہاں تو سب کچھ خموشی کی زبان میں کہا
جاتا ہے اور زبان نگہ مست سے سنا جاتا ہے ؎

ہے ہے وہ منتیں نگہ نیم مست کی
اب اس کے بعد شوق کا اظہار کیا کریں

نگہ مست کی منتوں میں کیا کچھ ہے جو اثر نے نہیں کہہ دیا۔ اثر کی زبان ایسی
سادہ و پرکار ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات اس میں کہہ جاتے ہیں۔ اگر دیکھا
جائے تو ان کی شاعری کا بیشتر حصہ سہل ممتنع پر مشتمل ہے۔ ایسا لگتا
ہے کہ وہ بہت آہستہ لب و لہجہ میں بات کر رہے ہیں۔ ان کا پورا کردار ان کی
شاعری کی زبان میں پوشیدہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی ایسی کسک ہے اور
ایسا اثر ہے کہ احساس کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ یہ سادگی اور
یہ شائستگی لکھنؤ کی اس کی تہذیب کے ساتھ ختم ہو گئی۔
آج کے عہد اور آج کی زندگی کا چہرہ اثر کے اس شعر کے آئینے
میں دیکھئے ؎

اب یہی ہے نباہ کی صورت
ناسزا سنئے مرحبا کہئے

اس کے علاوہ ان کے چند اور اشعار اسی سادگی اور پرکاری کے ملاحظہ
فرمائیں ؎

آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ
لو آئے تھے وہ پرسش بیمار کے لئے

کچھ جو کہیے تو ایک آفت ہے
چپ جو رہیے تو بات جاتی ہے

اثر میر کی شاعری کے زبردست معتقد اور مداح ہیں۔ یوں تو بیشتر شعراء
نے میر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے لیکن اثر کے یہاں یہ صرف خراج عقیدت
تک محدود نہیں ہے۔ اثر میر کی سادگی، تاثیر، جذبے کے خلوص
اور صفائی کے گرویدہ ہیں۔ رنگ میر ان کا پسندیدہ رنگ ہے۔ ان کے کلام
پر میر کا بہت گہرا اثر ہے اور بار بار وہ اپنی شاعری میں میر کا حوالہ دیتے ہیں

وہ جو ہے میرؔ کی غزل میں اثرؔ
سلکِ گوہر میں آب و تاب کہاں

اور اکثر اثرؔ، میرؔ کے اس ڈھب کو اپنے اشعار میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

شاد تو کیا برباد کرو گے
لو، دل لو کیا یاد کرو گے

اثرؔ انھیں سیدھے سادے لفظوں میں ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہوا کے تیز جھونکوں میں پھولوں کی ڈالیاں لہرا رہی ہیں جیسے کوئی 'سرمستِ مے ناب' دنیا سے بے خبر جھومتا ہوا چل رہا ہو ؎

امرت بھری آنکھوں میں مدھر آنکھ کی پتلی
رادھا ہے کہ گاگر لیے پنگھٹ پہ کھڑی ہے

فارسی کے ایک جدید شاعر ہوشنگ شفا کی ایک نظم میں سیاہ آنکھوں کے لیے بہت خوبصورت تشبیہ دیکھی تھی ؎

چشمے کہ چوں عصارۂ شب ہا سیاہ بود
چشمے کہ سایبانِ ہزاراں گناہ بود

اسی طرح اثرؔ نے محبوب کی سیاہ زلفوں اور ان کی لمبائی کے لیے جو استعارہ استعمال کیا ہے وہ مجھے کسی دوسری جگہ نظر نہیں آیا ؎

آبشار اک سیاہ بجلی کا
گیسوئے تابدار ارے توبہ

لکھنؤ کی تہذیب کی ایک خصوصیت مذہبی رواداری، میل و محبت اور دوسروں کے جذبات کا احترام ہے۔ آج بھی اس مٹے ہوئے لکھنؤ میں اس کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں گو کہ اسے ہر سطح پر مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ اسی تہذیب میں ممکن تھا کہ شیعہ علمار کی تعلیم فرنگی محل میں ہو اور سنّی علماء اور طلبا، درس کے لیے خاندانِ اجتہاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کریں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ساتھ بھی ایسی رواداری اور ایسا احترام کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئے گا جس کا نتیجہ ہے کہ سارے ملک میں ہنگامہ و فساد کے باوجود لکھنؤ میں کہیں ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ اثرؔ لکھنوی اسی تہذیب کے نمائندے ہیں جو کہتے ہیں ؎

نہ تو ہندو کوئی دیکھا نہ مسلماں دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

اثرؔ کی شاعری غزل کی شاعری ہے اور غزل کی شاعری بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے۔ اثرؔ غزل میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں تغزل کے ساتھ جو بے ساختگی ہے وہ بڑی اثر انگیز ہے۔

اک اچٹتی سی نگہ پر ہے یہ بیتابیٔ دل
حال پوچھے کوئی اس وقت تو مشکل ہو جائے

تیری نگاہِ ناز کے قربان جائیے
دل کی جگہ اب اک خلش جاں نواز ہے

اثرؔ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تشبیہ اور استعارے سے براہِ راست کم کام لیتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے سے عام طور پر اس جگہ کام لیا جاتا ہے جہاں براہِ راست کسی بات سے گریز کر کے اسے حوالے اور اشارے میں بیان کیا جائے تاکہ شعر میں ندرت اور اثر پیدا ہو سکے۔ لیکن اثرؔ لکھنوی مشابہت اور مماثلت سے کام لیتے ہیں اور واقعاتی رنگ دے کر اس سے ایسا امیج بناتے ہیں کہ اس کی اثر انگیزی دوبالا ہو جاتی ہے۔ اثرؔ کا ایک شعر ہے ؎

ان پہ ہنسیے شوق سے جو مائلِ فریاد ہیں
ان سے ڈریے جو ستم پر مسکرا کر رہ گئے

اثرؔ کے اس شعر میں سادگی، سلاست اور دل نشینی کے ساتھ جو معنی خیز تہ داری اور اثر انگیزی ہے وہ بہت کم کہیں ملتی ہے۔ اس بیان میں اثرؔ کی تہذیبی شناخت نمایاں ہے۔ وہ کچھ نہ کہنے پر بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ستم زدہ کی مسکراہٹ کیا کیا معنی رکھتی ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

اثرؔ لکھنوی تہذیب اور شائستگی کی ایسی تصویر تھے جس کی دوسری مثال کیا اب اس تصویر کی دل کشی اور دیدہ زیبی بیان کرنے والے بھی نہیں رہے لیکن وہ تہذیب آج بھی اثرؔ کی شاعری میں اسی دل کشی اور دلفریبی کے ساتھ زندہ ہے۔ انھوں نے سچ کہا تھا ؎

عابد سُہیل
حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

لکھنؤ کی ادبی سرگرمیاں

لکھنؤ کی ادبی سرگرمیاں یہ عنوان نوکِ قلم پر آتے ہی ذہن اس ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا ہے جو دیدہ ہے یا اس شنیدہ کی جانب جو کچھ اس طرح شعور کا حصہ بن گیا ہے کہ دیدہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس شہر میں "انگارے" کی اشاعت وجود میں آئی جس نے معرکۂ چکبست و شرر اور آتش و ناسخ اور ان کے حامیوں کی داد بیداد کی صورت تو اختیار نہیں کی لیکن ایک طوفان ضرور کھڑا کر دیا۔ جو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا اور شاید اسی طوفان کے سبب ایک ایسی کتاب جو ادبی نقطۂ نظر سے کسی خاص توجہ کی مستحق نہ تھی اگلے بیس پچیس سال کے ادب کی سمت و رفتار کا حوالہ بن گئی۔

رفاہ عام کلب کی عمارت اب بھی اپنے شاندار ماضی کی داستاں سنا رہی ہے۔ معلوم نہیں لکڑی کے فرش کا وہ بیڈمنٹن کورٹ جس پر تیس پینتیس سال ادھر تک کل ہند مقابلے ہوتے تھے اب کس حال میں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ انجمن تہذیب نو کی لائبریری کے بیش قیمت مسودات اور کتابیں اب موجود بھی ہیں یا دیمک کی غذا بن چکی ہیں۔ لیکن یہ عمارت زمین دوز ہو جائے اور اسکا نشان تک باقی نہ رہے پھر بھی اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا کہ اس کی چشم حیراں نے ملک کی سب سے بڑی ادبی تحریک کو جس کا دوسرا نام انجمن ترقی پسند مصنفین تھا چند نوجوانوں کے خواب سے حقیقت کی شکل اختیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس تحریک کے افکار و نظریات کے حامیوں میں کون سا نابغۂ روزگار اس وقت کا تھا جو شامل نہ تھا: رابندر ناتھ ٹیگور، مولوی عبدالحق، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائڈو، ولاتھول، شری شری، جے پرکاش نرائن، اچاریہ نریندر دیو اور اسی پایے کے نہ جانے کتنے دوسرے۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، پریم چند، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں اور متعدد دوسرے نوجوان ادیب اور شاعر تو خیر ابتدا ہی سے اس تحریک سے متعلق تھے لیکن تیس پینتیس برسوں کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالیے تو صف اول کے سارے نہیں تو تقریباً سارے ہی اہم ادیبوں کو اور شاعروں کو اس انجمن نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور جب اس نے خود کو ایک سیاسی جماعت کے ماتھے کی شکن میں اسیر کر لیا تو ایک جوئے کم آب بن گئی۔ لیکن اس دور میں بھی کسی قسم کی تنگ نظری کا سایہ تک لکھنؤ میں اس انجمن پر نہ پڑا اور اس کے ہفت روزہ جلسوں میں جو باقاعدگی سے سرور صاحب کے بیرور وڈ اور بعد میں نعمت اللہ روڈ کی قیام گاہ اور کبھی کبھی حضرت گنج میں یونیورسٹی ڈیلیگیسی بلڈنگ میں جو علیم صاحب کی قیام گاہ تھی باقاعدگی سے ہوتے تھے شہر کا شاید ہی کوئی ادیب، شہیر اور علوم و فنون کا ماہر ہو جس نے شرکت نہ کی ہو۔ ان جلسوں میں جعفر علی خاں اثر نے اپنی غزلیں سنائیں، مسعود حسن رضوی ادیب نے واجد علی شاہ پر اپنا معرکۃ آرا مضمون پڑھا۔ بین اقوامی شہرت کے مالک پروفیسر ڈی مکھرجی نے معاشی نظریات پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد نصیر نے جو بعد میں اقوام متحدہ سے متعلق ہو گئے تھے ہندوستان کی معاشی صورت حال پر مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے دورۂ روس کے تاثرات بیان کئے۔ یشپال نے اپنی ہندی کہانی سنائی۔ امرت لال ناگر نے "یہ کوٹھے والیاں" کا ایک باب پڑھا اور شہر کے اپنے وقت کے ایمبیسڈر نامی ریسٹورینٹ میں انجمن کی کانفرنس کے موقع پر جگر مرادآبادی نے اپنی مشہور غزل ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

سنائی اور داد کے ڈونگرے بٹورے۔

علی عباس حسینی اور مولانا اختر علی تلہری "پیروی مغربی" کی توجیہ پر احتشام صاحب سے بحث و تمحیص کے باوجود کبھی کبھی انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ان کا خیر مقدم کیا جاتا۔ حیات اللہ انصاری

بھی جنہیں ترقی پسندوں سے اس قدر چڑھ تھی کہ ان کے اکثر مضامین میں انہیں طنز و تسخر کا نشانہ بنایا جاتا نہ صرف کبھی کبھی انجمن کے جلسوں میں آتے بلکہ ترقی پسندوں کے خلاف اور گاندھی واد کی حمایت میں مضامین بھی پڑھتے۔ گرما گرم بحثیں ضرور ہوتیں لیکن انجمن کے دروازے ان جیسوں پر بھی کبھی بند نہ کئے گئے۔ بمبئی کی انجمن کی شاخ کی طرح نہ یہاں منٹو کو کبھی ٹاٹ باہر کیا گیا نہ خواجہ احمد عباس کو اور نہ سردار جعفری اور فراق کے مناقشہ میں ایک باقاعدہ سرکلر کے باوجود فراق گورکھپوری کے خلاف کوئی تجویز ہی منظور ہوئی۔

مجاز، سلام، شوکت صدیقی، نیاز حیدر، ڈاکٹر محمد حسن، باقر مہدی، رام لعل، مسیح الحسن رضوی، مکین احسن کلیم، حبیب احمد صدیقی اور منظر سلیم، مجید پرویز اور برج موہن ناتھ کا چر تو تقریباً ہر جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ اس دور میں جب انجمن کو سیاسی جماعت قرار دے دیا گیا تھا سلام مچھلی شہری اور ایاز انصاری تک جو آل انڈیا ریڈیو سے متعلق تھے تقریباً ہر جلسہ میں شرکت کرتے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں کے علاوہ شہر میں ادبی سرگرمیوں کے چند دوسرے مراکز بھی تھے۔ پرانے لکھنؤ میں فرنگی محل سے تقریباً ملحق اس ہوٹل کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ جس میں سراج لکھنوی، سالک لکھنوی، نہال رضوی لکھنوی، شارب لکھنوی اور متعدد دوسرے شعراء روزانہ ہی آتے۔ امین آباد میں دانش محل میں جعفر علی خاں اثر کبھی کبھی اور احتشام حسین، ممتاز حسین، عبادت بریلوی اور وقار عظیم اکثر آتے۔ ادبی محفلیں تو وہاں نہ ہوتیں لیکن گفتگو کا مرکز ادب ہی رہتا۔ نوجوان ادیبوں کا مرکز نظیر آباد میں کتابوں کی مشہور دوکان کتابی دنیا تھی، جس کے مالک اطہر نگرامی خود تو ادیب نہ تھے لیکن ان کی شخصیت میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ شہر کے سارے ہی نوجوان ادیبوں کے علاوہ کرشن چندر، شمع کے مدیر، یوسف دہلوی، و حیلر کے جنرل منیجر حیدر صاحب اور متعدد دوسرے ادیب جب بھی لکھنؤ آتے گھنٹوں ان کی چھوٹی سی دوکان پر بتاتے۔

شہر میں ادیبوں اور ادیب گروں کا ایک اور حلقہ تھا جس کی مرکزی شخصیت تھی نسیم انہونوی۔ اس میں شوکت تھانوی، صباح الدین عمر، امین سلونوی، عمر انصاری، سلامت علی مہدی، وحشی محمود آبادی وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر نے سر پنچ گروپ بھی دیکھا تھا۔ ان کا مرکز امین آباد کا نوری ہوٹل جسے یاران طریقت "ہوٹل نے سر بچاؤ" بھی کہتے اور نوری ہوٹل تھے۔ ان دونوں ہوٹلوں کی اب صرف یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔

حضرت گنج کا کافی ہاؤس اب بھی ہے، اپنے وجود کا عکس بنا ہوا ملگجی ملگجی سی فضا اور داستان پارینہ کی یاد دلاتے ہوئے رنگ و روغن سے تقریباً محروم در و دیوار لیکن وہ روشن ستارے اب کہاں جن کے دم سے اس کا سارا بھرم، ساری اہمیت قائم تھی۔ ان دنوں اس کی دنیا کچھ اور ہی تھی۔ ایک کونے میں اردو کے چند ادیب بیٹھے ہیں۔ پنڈت آنند نرائن ملا داخل ہوتے ہیں اور مسکراتے ہوئے اس میز کی جانب بڑھتے ہیں جہاں اس سرو قد اور خوبصورت شاعر، ماہر قانون اور بعد میں یو پی ہائی کورٹ کے جج کا خیر مقدم کرنے کے لئے سارے ہی لوگ کھڑے ہوگئے ہیں۔ ملا صاحب یہ دیکھ کر اپنی رفتار تیز کر دیتے ہیں اور کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بھی بٹھا دیتے ہیں اور خود بھی بیٹھ جاتے ہیں اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ملا صاحب جن کا یہ جملہ "میں اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہوں لیکن زبان نہیں بدل سکتا"، آج تک کسی نہ کسی طور پر زبان کے مسئلے پر ہونیوالے جلسوں اور کانفرنسوں میں دہرایا جاتا ہے۔ چابی کا گچھا ایک انگلی میں ڈالے دھیرے دھیرے گھما رہے ہیں۔ دو میزیں چھوڑ کر تیسری میز پر آل احمد سرور، ڈی پی مکھر جی، نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر ایم چلاپتی راؤ مصروف گفتگو ہیں اور ایک میز پر یشپال، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر کے این ککڑ، شری لال شکل۔ کافی ہاؤس باقاعدگی سے آنیوالوں میں چند ایسے بھی ہیں جو ادیب اور شاعر تو نہیں لیکن انکے ذکر کے بغیر تصویر کا وہ خاکہ بھی تیار نہیں ہو سکتا جس میں رنگ بھرا جا سکے۔

یہ ہیں بھیلا اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ملازم سدا سرن مصرا، سابق صحافی شیو پوری اور وضع قطع سے مولوی اور یو پی میں سگریٹوں کے ایک بہت بڑے تھوک فروش بم تسیم جو دوستوں کی خاطر مدارات کرنے میں بچھے جاتے ہیں۔ بھیلا بلیک برلس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں مشہور ہے کہ ہر صبح سو روپے کا ہرا نوٹ لے کر حضرت گنج آتے ہیں (اس نوٹ کو آج کے نہیں ۱۹۷۰ کی قیمتوں کے پیمانے سے ناپئے)، اور رات گئے گھر واپس جاتے وقت کسی دوست سے روپیہ دو روپیہ قرض لیتے ہیں اور کوئی ایسا نظر نہ آئے جس سے بے تکلفی ہو تو حضرت گنج سے ندان محل روڈ تک پیدل مارچ کر دیتے ہیں۔ سدا سرن مصرا اور بھیلا کا ذکر آئے تو ایک نیم ادبی بلکہ غیر ادبی حوالہ سے مجاز کا ذکر ضروری ہے کہ یہ دونوں ان کے رزم و بزم کے ساتھیوں میں بھی ہیں لیکن کافی ہاؤس کا ذکر اب بھی مکمل نہیں کیونکہ ڈاکٹر علیم کا نام تو آیا ہی نہیں۔

بارش دھواں دھار ہو رہی ہے اور ایک میز پر شوکت صدیقی، کمال احمد

صدیقی، مجید پرویز، خلیق ابراہیم، اور ایک دو نو واردانِ بساط ہوائے دل اس افسانے پر گفتگو کر رہے ہیں جس پر مجھے اتوار کو سرور صاحب کے بیرڈ روڈ والے مکان پر ہنگامہ خیز بحث ہوئی تھی کہ مجید پرویز ٹپ سے بول اٹھے "ایسی بارش میں علیم صاحب کیسے آئیں گے۔" شوکت صدیقی نے جو کاروبار تو جنگلوں کی لکڑی کا کرتے تھے لیکن افسانے "تانتیا"، "دوسرا آدمی"، "اور غم دل اگر نہ ہوتا"، لکھتے ہیں اپنے گھر گھنے اور ابھرے ابھرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں "ضرور آئیں گے"۔ لیکن بارش دیکھ رہے ہو ایک آواز ابھرتی ہے۔ شوکت کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں جہاں ایک کار دو رنگ چھینٹے اڑاتی گذر رہی ہے۔ اور اپنی بات دہراتے ہیں "ضرور آئیں گے"۔ شرط تیار ایک ایک کافی۔ لیجئے بحث ختم ساری آنکھیں کافی ہاؤس کے دروازوں پر ٹنگ جاتی ہیں۔ پھر سب ہی کسی بحث میں الجھ جاتے ہیں اور یکایک جو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو علیم صاحب موجود ہیں۔ سرخ و سپید رنگ فرینچ کٹ داڑھی، ہونٹوں میں سگار۔

سگار کی خوشبو پھیل جاتی ہے اور کونے کی ایک میز پر کئی دنوں بعد شاید کئی ہفتوں بعد، سلام مجاز سے پوچھتے ہیں۔ "جاوید" کا نیا شمارہ آیا۔ ابھی نہیں تمہاری نظم آ رہی ہے؟ سلام کی صحت ان دنوں خراب ہے۔ ان دنوں انکے منظوم خطوط کی دھوم مچی ہے ایک بار زور سے کھانستے ہیں اور کہتے ہیں بس یہ نظم چھپی ہوئی دیکھ لوں۔ زندگی اتنی مہلت تو دے دیگی نا!" مجاز جواب تو نہیں دیتے لیکن اداس ہو جاتے ہیں۔

مولانا آزاد علی گڑھ یونیورسٹی کی بحرانی کیفیت دور کرنے کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب کرتے ہیں اور چند ہی دنوں بعد شہر کے ادبی حلقوں میں خبریں گشت کرنے لگتی ہیں کہ علیم صاحب علی گڑھ جا رہے ہیں۔ لیکن علیم صاحب خاموش ہیں۔ پھر اس خبر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اسٹیشن پر سارے ہی ادیب اور شاعر انہیں رخصت کرنے کیلئے موجود ہیں۔ اب شہر کے نوجوان ادیبوں کی آنکھیں صرف سرور صاحب اور احتشام صاحب کے چہروں پر جمی رہتی ہیں۔ سرور صاحب کی شخصیت میں محبوبیت کے عنصر اور احتشام صاحب کے علم، تدبر، خلوص اور غم کی ایک ہلکی سی کیفیت اور غیر رسمی انداز نے انہیں شہر کے سارے ہی ادیبوں کا مرکز نگاہ بنا دیا ہے البتہ علیم صاحب کی سوچتی ہوئی آنکھیں اور بقول خلیل الرحمن اعظمی "مشکل کشا حیثیت" کی کمی ہر شخص محسوس کرتا ہے۔

ایک دن انجمن کے جلسے میں یکایک احساس ہوتا ہے کہ پرانی صفیں چھچ رہی ہیں اور نئے چہرے چھاتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ ہیں کون؟ قاضی عبدالستار، محمود الحسن رضوی، عابد سہیل، اقبال مجید، قمر رئیس، شارب ردولوی وارث کرمانی اور کئی دوسرے۔

رتن سنگھ اپنی پہلی کہانی ہادی سناتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے ہادی سے کون واقف نہیں۔ شہر کا ہر کھلاڑی نہ صرف ان کا مداح بلکہ معنوی شاگرد ہے لیکن اپنے افسانہ میں رتن سنگھ نے ہادی کو جس طرح زندۂ جاوید کر دیا ہے ایسے وہ شاید زندگی میں بھی نہ تھے۔ سینیر یا بزعم خویش سینیر ادیب پہلی ہی دوڑ میں ایک سکھ کو ملکھا سنگھ کی طرح سب سے آگے نکل جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو شکوک ان کی آنکھوں میں چٹکیاں کھاتے ہیں اور رام لال کی جانب نظریں اٹھاتے ہیں جو پنجابی کے اس شاعر کو اردو کا افسانہ نگار بنا دیتے ہیں، یوں مسکرا رہے ہیں جیسے یہ سکوت سخن شناس انہیں کے لیے ہیں۔ کئی ماہ بعد اقبال مجید نے "عدو چچا" سنا کر داد تحسین وصول کی۔ پھر ایک دن عابد سہیل اپنی کہانی "دو نقش ایک تصویر" سناتے ہیں اور صدر جلسہ باقر مہدی کی جانب دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سے بحث کا آغاز کرنیکے لئے کہتے ہیں تو افسانہ نگار کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ جاتی ہے۔ باقر مہدی عابد سہیل اور دوسرے کا و جلسہ کی طرف اپنی ہمیشہ بے قرار رہنے والی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگاتے ہیں، راکھ جھاڑتے ہیں اور بحث کا آغاز کرتے ہیں "صرف موضوع کی اہمیت کے پیش نظر میں نے اپنا ایک گھنٹہ ضایع کیا" یہ جملہ امین آباد کے چوراہے اور کافی ہاؤس کی میزوں پر گردش کرنے کے بعد جس اتوار کو نخاس میں پرانے سامان کے ساتھ فروخت ہوتا ہے اس اتوار کی شام میں احمد جمال بادشاہ اپنا مزاحیہ سناتے ہیں، "مجھے نہیں معلوم کہ میں نے سگریٹ پہلے پینا شروع کی یا ہوش پہلے سنبھالا لیکن اتنا خوب یاد ہے کہ جب ہوش سنبھالا تو سگریٹ پی رہا تھا"۔

احمد جمال پاشا انجمن میں تنہا نہیں آئے۔ اپنے ساتھ شوکت عمر، حسن عابد، سبط اختر، اقبال مجید، ذکی شیرازی، شکیب رضوی، عارف نقوی اور عثمان غنی کو بھی لائے۔ ان نوجوانوں نے اپنی تنظیم ادارہ ایوان ادب کو جس کے سکریٹری عثمان غنی تھے انجمن میں ضم کر دیا ہے۔

ان دنوں شہر کی ادبی سرگرمیوں کے ایک مرکز کا نام "نیا دور" بھی تھا جس کے ایڈیٹر کے طور پر نام تو علی جواد زیدی کا شائع ہوتا تھا لیکن سارا کام صاحب طرز نثر نگار فرحت اللہ انصاری دیکھتے تھے۔ حضرت گنج میں اس زمانے کے ایروز ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر فرحت صاحب کو دیکھ کر مجاز نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں فرحت مرحوم اور علی سردار جعفری ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے اور مجاز ان دونوں سے جونیر تھے۔ اس فرق کا پاس مجاز نے ہمیشہ کیا۔ فرحت صاحب نے انھیں دیکھ کر کہا۔

"شاعری بھی کر رہے ہو یا محض ؟"

ایک غزل کہی ہے لیکن ابھی نامکمل ہے" مجاز نے کہا

جلدی سے مکمل کر لو "نیا دور" کے اگلے شمارے میں اسے شامل کروں گا۔

مجاز خاموش کھڑے ہیں

"اور سہیل تم مجاز سے غزل لے لینا۔ ہر روز تقاضہ کرنا"

نیا دور کے کئی شمارے شائع ہو گئے۔ مجاز کی غزل کے بغیر ہی۔ پھر ایک دن مجاز نے وہ غزل عابد سہیل کو دی اور فوراً ہی شائع بھی ہو گئی۔ تین اشعار یاد رہ گئے ہیں۔

اشارہ ہے تیر طوفاں کی جانب
مگر میں ہوں کہ ساحل دیکھتا ہوں
تری آواز آئی آسماں سے
مگر میں جانب دل دیکھتا ہوں
مجاز اور میکدے میں سر بہ زانو
مآل زعم باطل دیکھتا ہوں

یہ اس کڑکڑاتے جاڑے کی رات سے چند ہی مہینے قبل کی بات ہے جس نے ایسا ستم توڑا کہ سارا شہر غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ صرف دو دن پہلے مجاز نے اپنی مشہور نظم "آوارہ" اور "نرس کی چارہ گری" کل ہند اردو کانفرنس کے مشاعرے میں سنائی تھی اور آج وہی شاعر شہر نگاراں نیو حیدرآباد کے اپنے مکان میں آخری سفر کے لئے ایسے تیار ہیں جیسے کبھی اس دنیا میں تھے ہی نہیں جنازہ آہستہ آہستہ قبرستان کی طرف بڑھ رہا ہے اور اردو کے درجنوں ممتاز شاعر اور ادیب جو حیدرآباد اردو کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے رنج وغم کی صورت بنے، آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے انھیں ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا رہے ہیں لیکن "آنسو ہیں کہ تھمتے نہیں"

منکی برج پر (موجودہ ہنومان سیتو کے قریب کا سابقہ پل) اب رات گئے "ماں، ماں" کی آواز کبھی نہ گونجے گی جو عالم بے خودی میں مجاز کے ہونٹوں سے اکثر بلند ہوتی تھی۔

بنے بھائی (سجاد ظہیر) کے پاکستان میں جیل سے رہائی کے بعد ہندستان آنے کی خبریں بہت دنوں سے گرم تھیں۔ کہ ایک دن معلوم ہوا کہ وہ پرسوں لکھنؤ پہنچ رہے ہیں۔ شہر کے تقریباً سارے ہی ادیب ان کے خیر مقدم کیلئے اسٹیشن پر موجود ہیں۔ روپوش زندگی اور جیل کی صعوبتوں کے نقوش ان کے چہرہ پر نمایاں ضرور ہیں لیکن دلوں کو جیت لینے والی مسکراہٹ اور عزم وارادہ کی دو قندیلوں نے ان نقوش کو دھندلا دیا ہے۔ چند دنوں بعد انھیں خوش آمدید کہنے کے لئے سرور صاحب کی صدارت میں انجمن کا جلسہ ہوا۔ نعمت اللہ روڈ والے ان کے مکان کا وسیع ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ پھر برآمدہ میں بھی تل رکھنے کی جگہ نہ رہی پھر یہی حال پورٹیکو کا ہوا۔ اس جلسہ میں احتشام صاحب اور سرور صاحب نے تقریریں کیں۔ بنے بھائی نے پاکستان کی ادبی فضا پر تفصیل سے روشنی ڈالی لیکن ان کی تقریر میں کسی قسم کی تلخی نام کو نہ تھی۔ پاکستان کے حکمرانوں کے لئے ایک کلمۂ ناملائم بھی نہ تھا۔

پھر ایک دن معلوم ہوا کہ سرور صاحب بھی علی گڑھ جا رہے ہیں۔ اس وقت انجمن کے سکریٹری عارف نقوی تھے۔ اگلی نشست احتشام صاحب کے یہاں ہوئی۔ جلسوں میں دھیرے دھیرے بے قاعدگی پیدا ہونے لگی۔ تنظیم بس برائے نام رہ گئی۔ عارف نقوی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، کرکٹ کھیلتے ہیں، کیرم اور شطرنج کے اچھے کھلاڑی ہیں کبھی کبھی افسانے بھی لکھ لیتے ہیں لیکن کوئی کام جم کر نہیں کرتے۔ ان نشستوں کو باقاعدگی بخشنے کے لیے کسی نئے سکریٹری کی تلاش ہو رہی تھی کہ معلوم ہوا احتشام صاحب پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے الہ آباد جا رہے ہیں۔ چلئے۔ انجمن کا سارا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔ بنے بھائی دہلی منتقل ہو گئے اور کچھ دنوں بعد رضیہ سجاد ظہیر بھی جو کرامت حسین ڈگری کالج میں اردو پڑھاتی تھیں دہلی چلی گئیں۔ کبھی کبھی انجمن کے جلسے برلنگٹن ہوٹل یا کسی دوسری جگہ ہوتے۔ ہر جلسہ میں نشستوں اور تنظیم کو وقار بخشنے کے منصوبے بنائے جاتے۔ کبھی کبھی نئے سکریٹری کا انتخاب بھی عمل میں آتا لیکن نیک ارادوں کے علاوہ ہاتھ کچھ نہ آتا اور یہی صورت آج تک برقرار ہے۔

شہر کی ادبی سرگرمیوں میں "قومی آواز" کا بھی اہم رول رہا ہے۔ ادبی اور ثقافتی جلسوں کی رودادیں ان دنوں تفصیل سے شائع ہوتیں منظر سلیم نے میگزین سیکشن کو ادبی وقار بخش دیا ہے۔ اخبار کے مراسلات کے کالموں میں ادبی مسائل پر خوب خوب بحثیں ہوتیں ایک بحث لفظ غنڈہ اور گنڈا کے سلسلے میں تھی اور بالآخر مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے مدلل مراسلے کے ذریعہ گنڈا کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اسی طرح کی ایک بحث میر انیس کے ایک شعر ؂

سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزہ گیاہ سے

پانی   سایہ

سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

پر ہوئی۔ محمد عسکری صاحب کا اصرار تھا کہ "سایہ کنویں میں اترا تھا" صحیح ہے کہ "پانی کنویں میں اترا تھا"۔ کم و بیش دو ماہ تک بحث کا سلسلہ جاری رہا جس میں پروفیسر جی۔ ایل بھارتی، سید مصطفیٰ حسین زیدی، ایم غلام حسین، خورشس صدیقی، محمد لیسین بہیردی۔ محمد انیس، محمد اسحاق صدیقی، ایم۔ ایچ صدیقی، کاظم علی خاں، حکیم شکیل شمسی اور متعدد دوسرے لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دلائل پیش کئے لیکن کنویں کے ساتھ چاہ کے استعمال کی جانب کسی نے اشارہ بھی نہ کیا۔

قومی آواز اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے صدق جدید کے درمیان مختلف مسائل پر بحث و تکرار کا سلسلہ برابر جاری رہتا لیکن حیات اللہ صاحب قومی آواز سے سبکدوش ہوئے تو مولانا نے ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے شذرہ کا اختتام اس مصرع سے کیا ؂

لذت غم نہ رہی یار کے اٹھ جانے سے

اور اس کے بعد مرتے مرگئے کبھی قومی آواز کا نام تک صدق جدید میں نہ لیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں تو سرد پڑ گئیں لیکن متعدد دوسری ادبی انجمنوں کے تحت ادبی جلسے برابر ہوتے رہے۔ اور سلسلہ اب بھی قائم ہے۔

اس ضمن میں "تھاٹ کلب" کا ذکر بھی ضروری ہے جس کے روح رواں پریس انفارمیشن بیورو کے انفارمیشن آفیسر ببو ماتھر تھے۔ اتوار کی شام میں ہونے والے اس جلسہ میں شرکا کی تواضع خوش مزاج، خوش اقدار، اور خوب رو ببو ماتھر کچھ اس فراخ دلی سے کرتے کہ چند ہی دنوں بعد یہ "تھاٹ کلب" "ٹھاٹ کلب" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ لیکن ان کے تبادلے کے بعد اتوار کی اس ادبی نشست کی جگہ بنٹوس ہوٹل کے سٹرڈے کلب نے لے لی۔ اردو اور ہندی کے مشہور ادیب، بیرا جو حضرت گنج کے اس ہوٹل میں دن بھر کیش میمو کاٹتے، بیروں کو ہدایتیں دیتے، ہوٹل میں آنے والوں کی سہولتوں کا خیال رکھتے اور افسانہ بھی لکھتے جاتے۔ سنیچر کی رات میں یہ جلسہ ۹ بجے شروع ہوتے اور بارہ بجے تک جاری رہتے۔ حیات اللہ انصاری، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر، رام لال، یشپال، رضیہ سجاد ظہیر، سجاد ظہیر اور دوسرے ادیب جب بھی لکھنؤ آتے سٹرڈے کلب کے جلسے میں ضرور شرکت کرتے لیکن یہ سلسلہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوا۔

اردو اکادمی کی دعوت پر فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، ظ انصاری، آل احمد سرور، قاضی عبدالستار، پنڈت آنند نرائن ملا، شہریار، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور متعدد دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے مختلف سیمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کی۔ ڈاکٹر محمد حسن جن دنوں اردو اکادمی کے چیرمین تھے پورے سات دن تک ایک جشن منایا گیا جس میں نیشنل بک ٹرسٹ کی اعانت سے کتابوں کا میلہ بھی لگا۔ خسرو سے لے کر اس وقت تک کے مشہور اور ممتاز ادیبوں کی تصاویر کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ سات دنوں تک اکادمی کا ماہنامہ خبر نامہ روزنامہ کی شکل میں شائع ہوا اور اردو کے آغاز اور ارتقا پر "روشنی اور آواز" کا پروگرام بھی چار پانچ دن تک جاری رہا۔ جسے بلا مبالغہ لاکھوں لوگوں نے دیکھا اور پسند کیا اور ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں شرکا کی فہرست دیکھ کر کسی نے فون پر دریافت کیا "مشاعرہ کتنے دن چلے گا"۔

اس دوران ایسی ادبی انجمنیں بھی قائم ہوئیں جنہوں نے فیض، بیدی، اور مجاز پر دو دو تین تین دن کے سیمینار کئے جن میں روس سے لے کر برطانیہ، کینڈا، ناروے اور دوسرے ممالک کے اردو ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ متعدد شاعروں اور ادیبوں کو انعامات و اکرامات سے بھی نوازا گیا۔

جدیدیت کی تحریک نے مقبولیت حاصل کی تو انیس اشفاق، نیر مسعود، شہنشاہ مرزا، قمر احسن اور کئی دوسرے ادیب یکایک ابھر کر پیش منظر میں آگئے۔ شہر میں اس تحریک یا رجحان کو مزید تقویت اس وقت حاصل ہوئی جب شمس الرحمن فاروقی محکمہ ڈاک و تار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو کر یہاں آئے لیکن کم و بیش دس سال جب وہ اس محکمہ کے اعلیٰ ترین عہدیدار کی حیثیت

سے دوبارہ آئے تو ادبی فضا یکسر بدل چکی تھی اور وہ خود بھی "نئے نام" سے داستانوں اور غالب اور میر کی شرحوں کی جانب ملتفت ہو چکے تھے۔

اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے چھوٹے بڑے جلسے اور تحریکیں بھی چلتی رہیں لیکن ان میں اہم ترین حیثیت غیر مسلم اردو ادیبوں کی ان دو شاندار کانفرنسوں کو حاصل ہے جن کے روح رواں رام لال تھے۔ ایک کانفرنس کے موقع پر انھوں نے غیر مسلم اردو ادیبوں کی ایک طویل فہرست بھی شایع کی جسے دیکھ کر کسی نے (نام لینے سے حاصل؟) کہا کہ مسلمان یہاں بھی اقلیت میں ہیں۔ کانفرنس تو ختم ہو گئی۔ لیکن یہ جملہ ایک عرصہ تک فضا میں گونجتا رہا۔

شہر کی ادبی اور ثقافتی زندگی کا ذکر نامکمل قرار پائے گا اگر میر اکادمی کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ ادارہ ہر دوسرے تیسرے سال اس دوران شایع ہونے والی کتابوں کے مصنفین اور درجنوں دوسرے ادیبوں کو انعامات و اکرامات سے نوازتا ہے۔

اردو زبان اور اس کی درس و تدریس کے مسائل اسطرح ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے ہیں کہ ایک کا ذکر دوسرے سے صرف نظر کر کے ممکن نہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کا شعبہ اردو جس میں کم و بیش ڈھائی سو طلبہ زیر تعلیم ہیں صرف ڈیڑھ کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک کمرہ میں صدر شعبہ بھی بیٹھتے ہیں۔ اسٹاف کے باقی اراکین اور کلاس بھی ہوتے ہیں۔ باقی آدھے کمرے کی نوعیت یہ ہے کہ شعبہ علوم مشرقیہ کا علیحدہ کمرہ جب خالی ہوتا ہے تو اردو طلبہ کے کام آجاتا ہے یونیورسٹی کے مالی حالات ایسے ہیں کہ نئی عمارت کی تعمیر ممکن نہیں اور کبھی اس کی نوبت آتی بھی ہے تو دوسرے اداروں کو اولیت مل جاتی ہے اور شعبۂ اردو کی "گوشہ نشینی" کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتی۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر سوڈھا نے مقبول احمد لاری ریسرچ اردو سینٹر کی تعمیر کے لئے مالویہ ہال کے سامنے اس جگہ پر جہاں پی اے سی اور پولس کے کیمپ لگے ہیں پانچ کمروں کی ایک عمارت کی تعمیر کے لئے لاری صاحب کی پیش کش قبول کر لی ہے۔ یونیورسٹی کی اصل عمارت کے طرز پر بنایا جانے والا یہ سینٹر فی الحال پانچ کمروں پر مشتمل ہو گا جن میں سے ایک کمرہ صدر شعبہ کے لئے وقف ہو گا۔ ایک اساتذہ کے لیے۔ ایک شعبہ کی لائبریری کے طور پر استعمال ہو گا۔ اور دو کمرے تعلیم و تدریس کے لیے استعمال ہوں گے۔

امید ہے کہ تعمیر کا کام جولائی میں شروع ہو جائے گا۔

ایسی ادبی انجمنیں جن میں کسی مروت اور میلان خاطر کے بغیر تخلیقات پر بحث و مباحثہ ہوتا ہو اب تقریباً ناپید ہیں لیکن متعدد انجمنوں کے تحت ادبی جلسے ضرور ہوتے رہتے ہیں۔ شعری نشستیں ان کے علاوہ ہیں۔ ان نشستوں میں پیش کی جانے والی تخلیقات سن کر احساس ہوتا ہے کہ جدید و قدیم اور ترقی پسندی اور جدیدیت کی دیواریں منہدم ہو چکی ہیں۔ پچھلے پچیس تیس برسوں کے دوران ان رسمی اور غیر رسمی نشستوں میں پیش کیے جانے والے چند اشعار آپ بھی سنیے:

ڈوبتے جاتے ہیں تارے بجھتے جاتے ہیں چراغ
یا بدلتے جا رہے ہیں سرخیِ افسانہ ہم

——— سالک لکھنوی

ذہن کچھ پتھرا گئے اور کچھ نے وہ باتیں گڑھیں
جن کو سن کر لفظ پچھتائے کہ کیوں پیدا ہوئے

——— منظر سلیم

اب تو اک مدت سے ہیں دیوار و در کی قید میں
ساتھ رہتے تھے کبھی صحرا، سمندر اور ہم

——— والی آسی

زباں کو خوش نہیں آتا کسی کا آب و نمک
عجب تبرکِ نانِ جویں ملا ہے مجھے

——— عرفان صدیقی

آنکھوں سے مری مجھ کو سمجھتا ہے شرابی
واعظ کو ابھی رند کی پہچان نہیں ہے

——— شارب لکھنوی

شہر کی ادبی فضا میں حسب سابق شاعری کو بالادستی حاصل ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ افسانوی ادب اور تنقید و تحقیق کے میدان میں بالکل سناٹا ہو۔ کاظم علی خاں اور ڈاکٹر اکبر حیدری کے تحقیقی مضامین ملک بھر کے ادبی جرائد میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں اور افسانوی ادب کو ڈاکٹر نیر مسعود، غضنفر اور وقار ناصری نئی جہتوں سے روشناس کرا رہے ہیں۔ مسرور جہاں نے بھی اپنے نئے ناولوں سے اپنے قارئین کے حلقے کو وسیع کیا ہے۔ □□

ابراھیم یوسف
۱۲۔ نیم روڈ، امامی گیٹ۔ بھوپال ۴۶۲۰۰۱

ایک تاریخ ساز تخلیق: امانت کی اندر سبھا

امانت کی اندر سبھا نہ صرف اس لئے "تاریخ ساز" ہے کہ اس نے اُردو ڈرامے کی بنیاد رکھی بلکہ اس لئے بھی تاریخ ساز ہے کہ اس نے ہندستانی تھیٹر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سنسکرت ڈرامے کے اسٹیج خالی کر دینے کے بعد لوک ناٹکوں نے اسٹیج پر قبضہ کر لیا تھا۔ بالخصوص راس لیلا، رام لیلا اور بھگت وغیرہ کے کھیل عام طور پر کھیلے جاتے تھے مگر ان کی نوعیت مذہبی تھی۔ اندر سبھا نے اس رجحان کو بدلا اور سماجی و معاشرتی ڈراموں کے لئے راہ ہموار کی۔ اس تبدیلی سے ہندستانی تھیٹر کی کایا پلٹ ہو گئی۔ آدیا رنگا چاری لکھتے ہیں: [1]

The year 1853 is noteworthy for two things. One was the Urdu play called Inder Sabha. This was written by Amanat, a court-poet of Wajid Ali Shah, the last Nawab of Oudh. It was all in verse, in stanzas of different metres and songs. It was produced in Lucknow. It was both an opera and a costume play with fairies dressed in different colours. There was no theme and no message but tuneful music and the eye-filling spectacle had such an appeal that, because of its popularity, many others were 'inspired' to write their own Inder Sabhas. The other notable event of the year was the founding of the first dramatic club, the Parsi Natak Mandali. The impact of these two events on the modern Indian theatre was to make it-self felt some two decades later.

باوجود تاریخ ساز ہونے کے اندر سبھا غلط فہمیوں کا شکار رہی اور تنقید کا نشانہ بنتی رہی۔ غلط فہمیاں یہ پیدا کی گئیں کہ یہ واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی اور وہ خود اس میں راجا اندر بنتے تھے اور یہ کہ اندر سبھا کا کھیل تیار کرنے کا خیال کسی فرانیسی نے واجد علی شاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا سہرا مصنفین ناٹک ساگر، نور الٰہی اور محمد عمر صاحبان کے سر ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں کہ:

"اندر سبھا کا تیار ہونا تھا کہ قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہو گیا جس میں فرانیسی ہدایت کے مطابق ہندوستانی حرفت نے اپنے جوہر دکھائے۔ مہ جبینان قیصر باغ پریوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں۔ واجد علی شاہ اندر کے تخت پر براجمان ہوئے باقی پارٹ با مذاق اہلِ دربار کو ملے۔ عوام کو اس محفل میں بار نہ مل سکا۔" [2]

مولانا عبد الحلیم شرر تحریر فرماتے ہیں:

"سری کرشن کی معشوقانہ روش عاشقی اس قدر پسند آئی کہ اس رہس سے ڈرامہ کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا جس میں خود کنھیا بنتے، مخدرات عصمت آب گوپیاں بنتیں اور ناچ رنگ کی محفل گرم ہوتی۔" [3]

نور الٰہی و محمد عمر صاحبان اور مولانا شرر کے مندرجہ بالا بیانات میں ایک بات مشترک ہے کہ واجد علی شاہ ڈرامے میں پارٹ ادا کرتے تھے۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ نور الٰہی و محمد عمر انھیں اندر کے تخت پر لا بٹھاتے ہیں تو شرر انھیں کنھیا بنا دیتے ہیں۔ رادھا کنھیا کا قصہ جو واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں اسٹیج کیا تھا، اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"سلطان پری نے رادھا کا، ماہ رخ پری نے کنھیا کا اور یاسمین پری، عزت پری، دل رُبا پری اور حُور پری نے گوالنوں کا پارٹ کیا تھا۔" [4]

اور جب یہی رہس تھوڑی تبدیلی کے ساتھ مٹیا برج میں کھیلا گیا تو نواب عباسی بیگم کنھیا بنی تھیں۔ اس قدر واضح ثبوت کے بعد مولانا عبد الحلیم شرر کا واجد علی شاہ کو کنھیا بنا دینا مفروضہ ہے۔

نورالہی و محمد عمر صاحبان اندر سبھا کو واجد علی شاہ کے ایما پر تحریر کیا جانا قرار دیتے ہیں لیکن امانت شرح اندر سبھا میں لکھتے ہیں کہ :

"ایک روز کا ذکر ہے کہ صاحبی مرزا عابد علی، یگانۂ ازلی، رفیق شفیق، مونس و غم خوار، قدیمی جاں نثار، شاگرد اول، موزوں طبیعت، تخلص عبادت عاشق کلام امانت۔ انھوں نے ازراہ محبت کہا کہ بے کار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے ایسا کوئی جلسہ رہس کے طور پر طبع زاد نظم کیا جائے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہوئے اور خلق میں شہرت ہوئے۔ آخرالامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا، دم بدم شوق زیادہ ہوا۔" [۵]

امانت کی اس تحریر کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ اندر سبھا مرزا عابد علی عبادت کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، واجد علی شاہ کے ایما پر نہیں۔

نورالہی و محمد عمر صاحبان اندر سبھا کا قیصر باغ میں کھیلا جانا بتلاتے ہیں لیکن امانت شرح اندر سبھا میں لکھتے ہیں کہ "دو شخص اس جلسہ کی تیاری پر آمادہ ہوئے۔" ظاہر ہے کہ یہ دو شخص قیصر باغ کے نہیں ہو سکتے تھے۔ ناصر لکھنوی جو امانت کے ہم عصر تھے، لکھتے ہیں :-

"میاں امانت نے ایک رہس کی طرح مثنوی اندر سبھا تصنیف کی تھی، اس میں بجائے امانت تخلص استاد قرار دیا تھا اور اس نے مثنوی غزلیں اور ہولی ٹھمری اور چھند زبان بھاکا میں کہی تھی چنانچہ جگا سنگھ پنڈت کشمیری اور بہاری کہار اور میر حافظ نے چند طفلان حسین اور امردان مہ جبین خوبصورت جمع کر کے اور ان لڑکوں کو مثنوی یاد کرا کے اور تعلیم راگ اور ناچ دلوا کے الگ رہس کھڑا کیا تھا۔ اور وہ پندرہ روپیہ روزینہ پر مجرے کو بھی جاتے تھے چنانچہ خلائق نے یہ جلسہ دیکھ کر بہت پسند کیا اور ہزار لوگ بازار میں جمع ہونے لگے۔ ایک روز مؤلف تذکرۂ ہذا بھی اس جلسۂ رہس اندر سبھا میں گیا، دیکھا میں نے کہ ہزارہا لوگ ان امردان حسین پر مفتوں و شیفتہ ہیں بقول شعر حسب حال ؎

ہجوم ماہ رویاں اس قدر تھا   کہ مجھ کو دل کے پس جانے کا ڈر تھا

اور میاں امانت مسند پر بیٹھے تھے اور ایک لونڈا حسین مہ پارہ آگے گاتا ہے میں یہ دیکھ بس چندے توقف کے بعد اپنے مکان چلا آیا۔" [۶]

کیا اس کے بعد بھی کوئی شک رہ جاتا ہے کہ اندر سبھا قیصر باغ میں کھیلی گئی تھی؟۔ اندر سبھا خالص عوامی چیز تھی، عوام نے ہی اسے تیار کیا تھا اور عوام ہی میں کھیلی جاتی تھی۔

نورالہی و محمد عمر صاحبان اندر سبھا کو اوپیرا قرار دیتے ہیں اور اس کے خیال کو کسی فرانسیسی کی طرف منسوب کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں :

"ہندوستان میں ڈرامے کا آغاز اوپیرا سے ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا طرح انداز کوئی فرنگی ہے بلکہ یوں کہیے کہ کوئی فرانسیسی ہے۔" [۷]

رام بابو سکسینہ اندر سبھا کو کلی طور پر اوپیرا تو نہیں مگر اوپیرا کی ایک قسم مانتے ہیں فرماتے ہیں :

"امانت نے ۱۲۷۰ھ (مطابق ۱۸۵۳ء) میں اپنی کتاب اندر سبھا تیار کی جو کامیڈی ہے اور چوں کہ اس میں گانا ناچ بھی شامل ہے لہذا موسیقی دار کامیڈی ہے جو اوپیرا کی ایک قسم ہے۔" [۸]

نورالہی و محمد عمر نے اسے مکمل طور پر اوپیرا اور رام بابو سکسینہ نے اوپیرا کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ جب ہم اندر سبھا کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں یوروپین اوپیرا کے اوصاف نظر نہیں آتے۔ یوروپین اوپیرا میں قصہ سے مربوط موسیقی کا تسلسل ہوتا ہے جو موقع اور واقعات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور یہ چیز اندر سبھا میں نہیں ہے۔ لیکن میوزیکل کامیڈی ہندوستان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ ہندوستان میں اس کی روایت زمانۂ قدیم سے موجود ہے۔ لوک ناٹک میوزیکل کامیڈی ہی کے انداز میں لکھے اور کھیلے جاتے رہے ہیں۔ امانت نے اندر سبھا کی تصنیف کے وقت انھیں لوک ناٹکوں کو پیش نظر رکھا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ :

"الحمدللہ کہ بھگت کا کوئی نام نہیں لیتا زمانہ اندر سبھا پر جان دیتا ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امانت کے پیش نظر بھگت کے کھیل تھے اور وہ

ان کے مقابلے میں اندر سبھا کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب "اندر سبھا اور اندر سبھائیں" میں ہندستان کے لوک ناٹکوں سے بحث کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ: "اندر سبھا رقص و موسیقی کی محفل مثنوی کے اسلوب، سوانگ اور بھگت کی تدبیر گری سے عالم وجود میں آئی ہے۔" اندر سبھا کی فنی اہمیت کو سب سے زیادہ ہندی کے ناقد ڈاکٹر گریش رستوگی نے محسوس کیا۔ ان کے ہندی زبان میں لکھے گئے ایک مضمون کا طویل اقتباس اردو رسم الخط میں پیش کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اندر سبھا کس طرح ہندستانی روایت اور تمثیل گری سے جڑی ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:

"کیا کارن ہے کہ امانت کی اندر سبھا جو سمپورن ہندی ناٹیہ ساہتیہ پر بھاؤ شالی پرمپرا سوتر رہی ہے اور سویم اپنے میں ایک سنسکرت رنگ منچی انوبھو ہے جس کو پرایہ ودیشی رچنا مانا جاتا رہا ہے اور جس کے پرتی سویم ہندی ناٹک کاروں کا ورودھ آتمک سوتر رہا ہے، اپنے سمے کی پرچلت لوک ناٹیہ شیلی کے کلا تتوں کو اپنے میں ملائے ہوئے ہے۔ ۱۸۵۰ء میں تشابدی کی اس اتینت لوک پریہ رچنا میں درباری واتاورن ودیشی اوپیرا سے کہیں ادھک دھیان آکرشت کرنے والی بات یہ ہے کہ وہ راس لیلا پدھتی پر لکھا گیا پہلا ناٹک ہے۔ اس بات کو کافی پہلے نٹ رنگ (انک ۴) میں ڈاکٹر سریش اوستھی نے اپنے ایک لیکھ میں استھاپت کیا۔ اندر سبھا میں پارسی رنگ منچ جیسا کہ رس، غزل، ٹھمری، شعر و شاعری میں بھی ہے اور راس لیلا جیسا سنگیت تتو، نرت تتو، شاستری سنگیت وے بھو بھی ہے۔ امانت بھی اسے جلسہ رہس کہتے ہیں۔ کتھا گائن، کاویہ پاٹھ اور نائکہ کا ابھاؤ گائن اور نرت دوارا نائکہ کتھا نک کا جڑتے جانا، پاتروں کا پرویش پرستھان، پاتروں دوارا سویم پریچے دے کر نائکہ پر یوجن کا سنکیت، کئی کئی چھندوں میں سمواد کا بولے جانا، گیتوں میں پرم دیا باروں، رتھوں، اتسووں کا ورنن آدی اسے راس لیلا شیلی سے جوڑتے ہیں۔ اندر سبھا کے آرمبھ کا کورس گان، پھر پورے ناٹک کے کورس گان لیلا ناٹکوں کی طرح ہیں۔ پرایہ سمواد وں کا نائکہ کتھا سے کوئی سمبندھ نہ ہونا بھی راس لیلا کی خوبی ہے۔ ایک ہی درشیہ میں کئی نائکہ وچار چلتے ہیں، یا الگ الگ گھٹنا استھل پر پہونچنے کے سنکیت اسے راس لیلا سے نکٹ کرتے ہیں۔ ان اپچارک سادہ منچ اور شیہ پر یورتن کا سروپ، پردے کا پریوگ، پردے کے پیچھے پاتر کا چھپے رہنا اور گاتے ہوئے پرویش کرنا دستوتہ راس لیلا ہی کے گن ہیں۔ اس درشٹی سے سمیکشا کرنے پر بھارتیندو یا بھارتیندو یوگین ناٹک کاروں کے وہ کھنڈن نرآدھار ہو جاتے ہیں جن میں اندر سبھا کو بھی ہندی ناٹک کی بھرشٹ وشئے تھا اس تھیتی کے پرتی گہری وسے تھا اور آکروش ویکت کرتے سمے گھسیٹ لیا گیا ہے جس کے پیچھے مکھیہ ہندی ناٹک کا جیون سے سماپت ہو جانا اور پارسی رنگ منچ کا پرچار ادھک ہے۔" ؎۹

ڈاکٹر گریش رستوگی کی اس وضاحت کے بعد یہ خیال بے معنی ہو جاتا ہے کہ اندر سبھا کا کوئی تعلق یورپین اوپیرا سے ہے۔ اندر سبھا خالص امانت کے ذہن کی پیداوار ہے جس نے اُردو ڈرامے کی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر اُردو تھیٹر پارسیوں کے ہاتھ میں پہونچ کر کاروبار بن گیا اور مغرب کی بھونڈی نقالی نے اس انفرادیت کو قائم نہ ہونے دیا۔

امانت کا کارنامہ یہی نہیں کہ انھوں نے اُردو تھیٹر کی بنیاد رکھی بلکہ ان کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہند ایرانی اور ہندو مسلمان روایات کو ایک دوسرے میں اس طرح ملا جلا دیا کہ ایک مشترک تہذیب اور مشترکہ قوم کا نقشہ نظروں کے سامنے آگیا۔ راجا اندر جو ہندو دیومالا کا مشہور دیوتا ہے اور ناچ گانے کا شوقین ہے اس کے دربار میں ہندستانی اپسرائیں نہیں ایرانی پریاں ناچتی گاتی ہیں۔ رہتی کوہ قاف میں ہیں مگر آتی ہندستانی اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر ہیں۔ بولتی اُردو زبان ہیں مگر گاتی ناچتی ہندی دھنوں اور گتوں پر ہیں۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ ٹھمری، ہولی اور بسنت بھی گاتی ہیں۔ گلفام اپنے لباس سے اودھ کا شہزادہ معلوم ہوتا ہے اور

اپنے عمل سے ایک زوال آمادہ سماج کا فرد۔ اور جب راجا اندرا سے بند کرتا ہے تو ہندستان کا قید خانہ نہیں ہوتا بلکہ ایرانیوں کا قید خانہ کنواں ہوتا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

"سبز پری اس کے (گلفام کے) فراق میں بیتاب ہوتی ہے تو ہندوستان کی جوگن بنتی ہے جس کے چہرے اور پنڈے میں ہندستان کی بھبھوت ملتی ہے، سر پر ہندوستانی انڈوا ہے، زُلفیں ہندوستانی جوگنوں کی جٹائیں ہیں، کندھے پر ہندستان کا پُرانہ باجا بین ہے۔ اس کے نغمے میں فارسی شاعری، ہندوستانی موسیقی، لکھنؤ کی ٹھمریاں، ہندوؤں کی ہولیاں اور اُردو اور بھاشانہ باتیں ہیں اور یہ سب چیزیں مل کے ایسی پرلطف ہوگئی ہیں کہ اس سے زیادہ بہتر مجموعہ مختلف مذاقوں کے یکجا ہوجانے کا بمشکل نظر آسکے گا۔" [۱۰]

اندرسبھا جس طرح غلط فہمیوں کا شکار رہی ہے اسی طرح تنقید کا نشانہ بھی بنتی رہی ہے۔ آدیا رنگاچاری کو شکایت ہے کہ اس میں کوئی پیغام نہیں دیا گیا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

"اندرسبھا کی کہانی میں نہ کوئی جدّت تھی نہ کوئی ندرت۔ ہندو دیومالا کے مشہور کردار راجا اندر کے گرد ایک معمولی سی کہانی کے تانے بانے سے منظوم ڈراما تیار کیا گیا تھا، جس پر میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کا غیر معمولی اثر نظر آتا ہے لیکن امانت نے اس خلا کو اس طرح پُر کردیا کہ گویا اس وقت ڈراما کی دیوی جاگ اُٹھی۔" [۱۱]

احتشام صاحب اندرسبھا کی اس اہمیت کو تو مانتے ہیں کہ اس کی تخلیق سے ڈرامے کی دیوی جاگ اٹھی لیکن وہ اس کے پلاٹ کو راجا اندر کے گرد گھومتا ہوا ایک معمولی پلاٹ قرار دیتے ہیں۔ اوّل تو یہ متنازعہ مسئلہ ہے کہ پلاٹ راجا اندر کے گرد گھومتا ہے یا سبز پری کے گرد۔ اس سے قطع نظر پلاٹ پر اس طرح تنقید یا اندرسبھا میں کسی پیغام کی تلاش بیسویں صدی کے ڈراموں کے لئے تو مناسب ہے لیکن انیسویں صدی کے ڈراموں کے لئے نہیں۔ انیسویں صدی میں کھیلی جانے والی راس لیلاؤں اور رام لیلاؤں میں بھی کوئی پیغام نہیں ہوتا تھا اور ان میں سری کرشن اور رام چندر جی کے گرد گھومنے والا پلاٹ ہوتا تھا۔ اندرسبھا کے فن کا مقابلہ اپنے ہم عصر ڈراموں سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی کے ترقی یافتہ ڈراموں سے نہیں۔

جب ہم اندرسبھا اور شرح اندرسبھا کا فنی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں ہمیں اسٹیج اور تھیٹر کا کوئی واضح تصور نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امانت نے رقص و موسیقی کی محفل میں قصے کا اس طرح اضافہ کردیا ہے کہ یہ رقص و موسیقی کی محفل ایک دوسرے انداز سے سجائی جاسکے کہ لوگوں کو تفریح کا کچھ اور سامان میسر آسکے۔ رہس اور سوانگ کے مقابلے میں زیادہ خوش سلیقگی ہو۔ سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد جب راس لیلا رام لیلا، بھگت اور سوانگ عوام میں مقبول ہوئے تو ان کی پیش کش انتہائی سادہ انداز میں کی جاتی تھی۔ امانت نے پیش کش کے اسی سادہ انداز کو اپنایا۔ لیکن اسکرپٹ میں تھوڑی تبدیلی کی یعنی آمد کا گایا جانا اور حسبِ حال شعر خوانی۔ یہ دونوں چیزیں نہ تو سنسکرت ڈرامے میں ملتی ہیں اور نہ لوک ناٹکوں میں۔ یہ خالص اُردو ڈرامے اندرسبھاؤں میں ملتی ہیں۔ سنسکرت ڈرامے میں ناندی کا رواج تھا جس میں ڈراما شروع ہونے سے پہلے کسی دیوتا کی حمد گائی جاتی تھی اور آشیرواد دیا جاتا تھا اور آخر میں بھرت کا دیہ ہوتا تھا اس میں پرا تھا اور آشیرواد ہوتا تھا، آغاز میں سوتر دھار مصنف اس کی تصنیف اور کرداروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا تھا۔ ان کی جگہ پر امانت نے آمد اور حسبِ حال شعر خوانی کو داخل کیا اور بھرت کا دیہ کی جگہ پر مبارکباد۔ اس طرح امانت نے اپنا الگ راستہ بناکر ایسی روایت کی بنیاد ڈالی جو عرصہ تک اُردو ڈرامے پر اثر انداز ہوتی رہی اور بہ قول وقار عظیم:

"یہی چیزیں ہیں جن کی بنا پر ہم اندرسبھا کے فنی مرتبے کا تعین کرتے وقت اس بدیہی نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ اندرسبھا ہمارے ڈرامائی فن کی بنیاد اور اس کا ایک اہم سنگِ میل اندرسبھا اور اس سے بھی زیادہ شرح اندرسبھا نے اسٹیج کی جن روایات اور ہدایات کو اُردو کے ڈرامائی فن کا پیش خیمہ بنایا ہے وہ اس اہم کتاب کی تصنیف کے

ایک صدی بعد بھی اُردو ڈرامے کے ناگزیر اجزا رہیں۔ اندر سبھا اور شرحِ اندر سبھا کے بنائے ہوئے نقوش اُردو ڈرامے کے فن کی پوری روایت پر چھائے ہوئے ہیں اور ہمارے مشہور ڈرامے میں کہیں نہ کہیں اس روایت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔" [13]

جب ہم اندر سبھا کا مطالعہ کرتے ہیں تو ابتدا سے ہی یہ تاثر پیدا ہو جاتا ہے کہ امانت نے "دو چار گھڑی دل لگی کی صورت" پیدا کرنے کا ذریعہ رقص و موسیقی کو بنایا ہے۔ رقص اور موسیقی کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب ضمنی ہے جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب سبز پری کالے دیو سے گلفام کو اُٹھا لانے کو کہتی ہے اور کالا دیو اسے اُٹھا لاتا ہے تو یہ تمام واقعہ مشکل سے سات شعروں میں ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ امانت گلفام کا گانا سننے اور سنانے کے لئے بے چین ہیں۔ چونکہ قصے کی بنیاد رقص و موسیقی پر ہے اس لئے امانت نے ہر مذاق کے لوگوں کا خیال رکھا ہے۔ شروع سے آخر تک غزلوں کے ساتھ ساتھ ٹھمریاں، بسنت، ہولیاں اور چھند برابر گائے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ موسم اور وقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ چنانچہ شرحِ اندر میں پکھراج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"چھند کے بعد ٹھمری گاتی ہے، ٹھمری کے بعد ہولی کی فصل میں ہولی نہیں تو غزلیں گاتی ہے۔"

چونکہ اندر سبھا رات بھر کھیلی جاتی تھی اس لیے شب کے کون سے حصے میں کون سی دُھن گائی جائے اس کا بھی امانت نے خاص خیال رکھا ہے چنانچہ ابتدائے شب میں دھن بہار، کھماج اور دیس، درمیانی شب میں پرج اور دیس اور آخر شب میں بھیرویں کے استعمال کی ہدایت کی ہے۔ غزلوں کے لئے مترنم مجروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ قافیہ اور ردیف میں صوتی آہنگ موجود ہے۔ امانت نے دوسرے گانوں کے مقابلے میں غزلوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ غزلیں اس دور کے لکھنوی ذوقِ شعر کے مطابق ہیں۔ ان غزلوں میں جس محبت کا تذکرہ ہے اس میں بازاری اور سوقیانہ پن ہے۔ عاشق اور معشوق کے درمیان کسی قسم کی پردہ داری نہیں بوسہ کی طلب میں کوئی اخلاقی قدر مانع نہیں۔ جذبۂ محبت میں خلوص کی سادگی نہیں، جھوٹے جذبات کا اظہار ہے جو ایک زوال آمادہ سماج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ برخلاف غزلوں کے جو گیت اندر سبھا میں گائے گئے ہیں، ان میں ہندی شاعری کی روایت کے مطابق اظہارِ محبت عورت کی طرف سے کیا گیا ہے ان میں جذبہ کا خلوص اور سچائی موجود ہے۔ اس طرح امانت نے موسیقی میں ایسا تنوع پیدا کر دیا ہے جس سے ہر مذاق کے لوگوں کی تسکین ہو سکے۔ غرض یہ کہ امانت نے ایک ایسی روایت قائم کر دی جو تقریباً نصف صدی تک اُردو ڈرامہ کی بنیاد بنی رہی اور ہماری فلمیں آج تک اندر سبھا کی اس روایت کو نبھا رہی ہیں۔

باوجود اپنی چند خامیوں کے اندر سبھا امانت کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُردو ڈرامہ امانت کے احسان سے سبکدوش ہو سکتا ہے۔

□□

حواشی:

1. The Indian Theatre: Adya Rangacharya:- P 98
2. ناٹک ساگر (اترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ) نور الٰہی و محمد عمر ص ۳۶۲
3. گزشتہ لکھنؤ (نسیم بکڈپو لکھنؤ) عبدالحلیم شرر۔ ص ۱۰۱
4. بحوالہ اُردو ڈراما اور اسٹیج: سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ۱۱۲
5. " " " " " " ص ۱۸۰
6. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا۔ ناصر لکھنوی۔ مرتبہ شمیم انہونوی ص ۱۹۲
7. ناٹک ساگر: نور الٰہی و محمد عمر ص ۳۶۱
8. تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) رام بابو سکسینہ۔ مترجم مرزا محمد عسکری ص ۱۴۶
9. راس لیلا کا ہندی ناٹیہ رچنا پر پربھاؤ (بزبان ہندی) ڈاکٹر گریش رستوگی:
   چھایانٹ لکھنؤ: شمارہ ۱۵ اکتوبر تا دسمبر ۸۰ء ص ۱۵-۱۶
10. شعر الہند (حصہ دوم) مولانا عبدالسّلام ندوی ص ۲۰۲
11. عکس اور آئینے: پروفیسر احتشام حسین ص ۲۷
12. اندر سبھا کا فنی پہلو: وقار عظیم، ماہِ نو کراچی۔ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۲۳

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی رُدولوی
گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ

تعلقدارانِ اودھ اور اُن کی ادبی خدمات

اودھ میں تعلقداروں کا وجود بہت قدیم ہے۔ تقریباً آٹھ سو سال قبل ملک کے مختلف مقامات سے راجپوت اودھ آئے اور یہاں کی تھارو، بھر اور آرک قوموں کو شکست دی۔ یہاں وہ حاکمانہ انداز سے آباد ہو گئے۔ آراضیوں کو چھوٹے چھوٹے تعلقوں کی شکل دے کر آپس میں تقسیم کر لیا۔ اپنے اپنے علاقوں کے سردار بن گئے انھیں سرداروں کو بابو، بھیا، ٹھاکر، راجہ یا تعلقدار کہا جانے لگا۔ شیخوں کے دور اقتدار میں بھی تعلقداروں کی حیثیت بدستور رہی۔

جب سلطنت مغلیہ نے ۱۷۲۰ء میں میر محمد امین معروف بہ سعادت خاں برہان الملک کو اودھ میں اپنا وزیر مقرر کیا تعلقداروں کی اچھی خاصی تعداد یہاں موجود تھی۔

نوابین اور سلاطین اودھ کو ان تعلقداروں پر بہت ناز تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس نے ۲۱ نومبر ۱۸۵۵ء کو سلطنت اودھ ختم کر کے اس پر قبضہ ریزیڈنٹ جنرل اوٹرم کو کر لینے کا حکم دیا۔ جنرل اوٹرم نے ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو زبردستی قبضہ کر لیا اور اودھ کے چیف کمشنر بن گیے تو شاہ اودھ واجد علی شاہ نے تعلقداروں کو فرمان بھیجا:-

"ما بدولت نے آج کی تاریخ سے تم سب کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کیا۔ تمہیں چاہئے کہ کمپنی مذکور کے احکام کی تعمیل کرو اور اپنے تئیں ان کی رعایا سمجھو۔"

واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد بھی تعلقداروں کا رعب و دبدبہ کچھ خاص کم نہ ہوا تعلقداروں کے اثرات اور عوام میں ان کی مقبولیت دیکھ کر انگریز ان سے بہت مرعوب تھے جس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل بیانات کافی ہیں۔ رابرٹ مانٹگمری کمشنر اودھ حکام کو نصیحت کرتے ہیں:-

"اگر مضبوط اور مستحکم حکومت قائم کرنا ہے تو .... یہاں کے روساء و عمائدین سے تواضع اور اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔" (از انجمن ہند صـ۱۹)

تعلقداران اودھ کا دور اقتدار نوابین اودھ کے عہد (۱۷۲۰ء) سے شروع ہوتا ہے اور سلطنت برطانیہ کے غروب آفتاب (۱۹۴۷ء) تک رہتا ہے۔ اودھ کی تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ کے عروج کا زمانہ بھی یہی تھا۔ اودھ کی وہ تہذیب جس کی بدولت اودھ کو دنیا بھر کی ترقی پذیر اور ترقی یافتہ سبھی قوموں نے اپنی آنکھوں میں جگہ دی اس کی مشاطگی میں تعلقداروں نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور اودھ کی تہذیب مرتے دم تک ان کی مرہون منت رہے گی۔

اودھ کے تعلقدار فنون لطیفہ (موسیقی، رقص، سنگ تراشی، مصوری، شعر و ادب) کے بڑے دلدادہ تھے۔ اس وقت شعر و ادب سے متعلق ان کی دلچسپیاں اور خدمات موضوع سخن ہیں۔ سلاطین اودھ اور حکومت فرنگ دونوں میں ان کی چڑھی بارگاہ تھی۔ لہذا انھوں نے ادیبوں، شاعروں اور صاحبان ذوق کو انعام و اکرام، وظائف اور عہدوں کے ذریعہ اعزاز بخشا ہمت افزائی کی اور انھیں باعزت اور بافراغت زندگی گذارنے کا موقعہ عطا کیا۔ مثال کے طور پر ریاست محمود آباد سے جو شعراء اور ادباء وابستہ رہے ان میں عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، ثاقب لکھنوی، ظریف لکھنوی، مرزا محمد عسکری، مائل جائسی، ریاض خیرآبادی، جالب دہلوی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد حسین مدیر اودھ پنچ، ممتاز حسین عثمانی، مہدی حسن احسن سرفہرست ہیں۔ التفات رسول ہاشمی تعلقدار سندیلہ کے دربار سے آرزو لکھنوی متعلق رہے۔ انھیں تعلقداروں کے مالی تعاون اور توجہ سے ادبی شہپارے بھی زیور طبع سے آراستہ ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً ریاست محمود آباد کے دارالتصنیف و

تالیف سے ظریف اور ثاقب کے ضخیم دواوین شایع ہوئے۔ اردو شعر و ادب کی خدمتیں انگریزی حکومت میں زیادہ ہوئیں کیونکہ انگریزوں نے اردو کو سرکاری زبان بنایا۔ اس سے پہلے سرکاری زبان فارسی تھی۔

تعلقداران اودھ کے اشاروں پر ادبی انجمنیں قائم ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے مشاعرے اور ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ شعرا کے کلام کے گلدستے چھپتے رہتے تھے۔ یہ لوگ خود بھی شاعر اور ادیب ہوتے تھے۔

یہاں چند تعلقداروں کے ادب سے وابستگی کا ذکر اختصار سے کیا جارہا ہے

۱) اثیم جرولی: نام سید ظفر مہدی (۱۹۴۱-۱۸۴۴) والد: سید حسن ذکی۔ تعلقہ: علی نگر (جرول بہرائچ) تلمیذ: مرزا دبیر۔ تلامذہ: فائق، محزوں، نادر، نصیر، ہادی، شیو نرائن ہوش، اثر، بہاری لال جنوں یہ سب آپ کے دربار میں حاضر رہتے تھے اور اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ آپ جید عالم دین بھی تھے۔ بہرائچ کے آنریری اسسٹنٹ کمشنر تھے۔

آپ نے قصیدے، مرثیے، سلام، رباعی، قطع وغیرہ بہت کافی تعداد میں کہے ہیں آپ کے نثری کارنامے بھی بہت وقیع ہیں۔

مطبوعہ نثری کارنامے: تہذیب الخصائل (۲ جلدیں)، ۲۔ روضۃ العارفین (۲ جلدیں)، ۳۔ حدیقۃ السادات، ۴۔ موتیوں کا ہار، ۵۔ معیار المحبت۔

غیر مطبوعہ کارنامے: اشک مسلسل (۵۰۰ بند کا ایک مرثیہ) ۲۔ دس مرثیے۔ ۳۔ متعدد سلام قطعے قصیدے اور رباعیاں وغیرہ۔ آپ کے بیٹے سید حیدر مہدی شمیم اور سید باقر مہدی بلیغ تھے۔ دونوں عالم دین اور شاعر تھے۔ آپ کے اخلاف میں سید فضل مہدی نسیم، اکبر مہدی سلیم، اور سید اکبر مہدی نعیم، اطہر مہدی قسیم، مسلم مہدی صمیم اور سید جعفر مہدی کلیم ہیں۔ اسی سلسلے میں سید امیر حیدر رامبر اور سید نظیر حیدر راقبال بھی ہیں۔ ادبی خدمات میں آپ کی چوتھی پشت چل رہی ہے۔

نمونہ کلام: اشک مسلسل کا ایک بند پیش ہے۔ ؎

گل کیوں چمن میں چاک گریباں ہے آجکل
سنبل برنگ زلف پریشاں ہے آج کل
کیوں سرو مثل بید کے لرزاں ہے آجکل
کیوں اشک ریز نرگس حیراں ہے آجکل
تبدیل کیوں لباس گل جعفری ہوا
کیوں پیرہن گلاب کا نیلوفری ہوا

(۲) امیر بہوی: نام ٹھاکر سید امیر حیدر خاں (۱۹۳۶-۱۸۷۰) والد: ٹھاکر سید مجیب حیدر مجیب۔ تعلقہ: بہوا (ضلع رائے بریلی)۔ بلند پایہ شاعر تھے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے والد بھی اچھے شاعر تھے اور شاہ حسن جائسی کے تلمیذ تھے۔ آپ کے اخلاف میں آج تک شعر گوئی کا سلسلہ قائم ہے صغیر کاظم اور اعجاز کے دم سے چراغ شاعری روشن ہے۔ آپ کے دیگر اہل خاندان عباس، عشرت، صفدر، اطہر، پرویز، نیاز، نسیم، ظہیر، راہی (قومی آواز کے کالم نگار)، وغیرہ اچھے شاعر ہیں۔ امیر کے کلام کا ذخیرہ بہت ہے مگر سب غیر مطبوعہ۔ نمونہ کلام: ؎

ترحم اب تو لازم ہے میرے حال شکستہ پر
شب فرقت کی سختی کو بہت کھا کھا کے غم کاٹا

(۳) بسمل لکھنوی: نام چودھری مصطفی احسین (۱۹۵۷-۱۸۹۳) والد: چودھری کاظم حسین۔ تعلقہ: غازی پور (لکھنؤ) تلمیذ: جبار لکھنوی اور صفی لکھنوی۔ آپ کا ایک دیوان "اوراق پریشاں" چھپ چکا ہے۔

نمونہ کلام: ؎

یارب کسی سے چھین کے مجھ کو خوشی نہ دے
جو دوسروں پہ بار ہو وہ زندگی نہ دے

(۴) سحر: نام راجہ نواب علی خاں (۱۸۵۸-۱۸۱۰) والد: میاں امیر علی خاں بہادر تعلقدار بلہرہ (بارہ بنکی) تلمیذ: ناسخ لکھنوی کے بعد شاہ اودھ واجد علی شاہ۔ شاہ اودھ نے مقیم الدولہ، اور قیام جنگ کے خطابات عطا کیے۔ آپ نے انگریزی فوج سے گیارہ مقامات پر مورچہ لیا اور عالم نگر کے معرکے میں زخمی ہوگئے۔ انگریزوں نے پہلے ان کو اپنا طرفدار بنانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر جب کامیاب نہیں ہوئے تو ان کی جان کے دشمن ہوگئے محمود آباد میں مقیم منزل کو توپ سے اڑا دیا۔ اتفاق سے مقیم الدولہ اس وقت اس میں مقیم نہیں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے اس خیال سے کہ کہیں انگریزوں کے ہاتھ نہ پڑ جائیں اور ذلیل ہونا پڑے اپنے ہاتھوں عزت کی موت قبول کرلی۔

آپ نے نظمیں، ہفت بند، غزلیں، مثنویاں، تاریخیں، واسوخت، سلام رباعیاں، قصیدے اور قطعے کہے ہیں۔ مذہبی شاعری کے لیے آپ نے وہب تخلص اختیار کیا تھا۔ آپ کا مجموعہ کلام "بیاض سحر" کے نام سے چھپ چکا ہے

نمونہ کلام: ؎ کیوں نہ ہو جاں بخش، روح افزا فضائے لکھنؤ
رشک انفاس مسیحا ہے ہوائے لکھنؤ

آپ کے انتقال کے وقت آپ کے ولی عہد بہادر راجہ محمد امیر حسن خاں التخلص بہ سحر و حبیب (۱۹۰۳ - ۱۸۶۹) صرف نو سال کے تھے۔ علاقہ انگریزی سرکار ضبط کر لیتی مگر مرزا عباس بیگ (مرزا غالب کے بھانجے) کی کوشش سے بچ گیا۔ آپ نے بھی غزلیں رباعیاں۔ قطعے۔ نوحے۔ سلام اور مرثیے لکھے ہیں۔ آپ کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ نمونہ کلام ؎

عیاں ہوئی نہ مری ہستی عدم کی شان
میں قلب سنگ میں پنہاں رہا شرر کی طرح

آپ کے بعد آپ کے ولی عہد مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں التخلص بہ ساحر و محب۔ (۱۹۳۱ - ۱۸۷۸) جانشین ریاست ہوئے۔ مہاراجہ کے بڑے بیٹے اور ریاست کے ولی عہد راجہ محمد امیر احمد خاں التخلص بہ تجرد و محبوب (۱۹۰۳ - ۱۹۱۴) تھے۔ اس عہد میں عصری سیاست پورے شباب پر تھی۔ دانشوران سیاست آپ کے حلقہ گوشوں میں تھے۔ جناح، گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو۔ سروجنی نائڈو، شوکت علی حسرت موہانی اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ کی نشستیں آپ کے دولت کدے پر ہوا کرتی تھیں اور جنگ آزادی لڑنے کے طریقے طے ہوتے تھے۔ مہاراجہ صاحب اور ولی عہد بہادر نے مرثیوں کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مہاراجہ صاحب کے مرثیوں کا ایک مجموعہ مراثی محب کے نام سے چھپ گیا ہے۔ مگر ولی عہد بہادر کا سارا کلام غیر مطبوعہ ہے۔ مہاراجہ صاحب کے دوسرے بیٹے مہاراجکمار امیر حیدر خاں صاحب التخلص بہ مسحور و حب (۱۹۹۱ - ۱۹۱۸) بھی اچھے شاعر تھے۔ بہت سے اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر کلام ابتک غیر مطبوعہ ہے۔

(۵) علی محمد زیدی: ولادت ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء والد: چودھری سید محمد حسین۔ آپ چودھری سید ارشاد حسین (۱۹۵۴ - ۱۸۸۶) کے جانشین ہیں۔ تعلقہ نرولی ہے دینی خدمات اور ریاستی امور سے کچھ وقت نکال کر تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ہیں۔ آپ نے ایک محتاط مورخ کا مزاج پایا ہے۔

مطبوعہ تصانیف: ۱۔ مصباح الزائرین۔ ۲۔ العزاء۔ ۳۔ اپنی یادیں ردولی کی باتیں۔ ۴۔ بارہ بنکی۔ ۵۔ ابن حسن اور ردولی۔ ۶۔ تقویم حسن۔

غیر مطبوعہ کتابیں: ۱۔ آئینہ حقیقت ۲۔ چودھری ارشاد حسین۔ ۳۔ تاریخ اودھ۔

(۶) گویا: نام فقیر محمد خاں (۱۸۵۲ - ۱۷۸۵) والد: محمد بلند خاں۔ تعلقہ: سہلامئو کسمنڈوی خرد۔ تلمیذ: ناسخ یا خواجہ وزیر۔ شاعر، نثر نگار اور فوج کے سالار تھے۔ کسی کو سیف و قلم دونوں پر قدرت کم ملتی ہے۔ جعفر ملیح آبادی کی تصنیف ”گویا۔ صاحب سیف و قلم“ میں آپ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ آپ کا تذکرہ کئی تذکروں میں ملتا ہے۔ جس کی نشاندہی جوش نے اپنی ”یادوں کی بارات“ میں صہ ۲۴ پر کر دی ہے۔

آپ نے ”انوار سہیلی“ کا ترجمہ ”بستان حکمت“ کے نام سے کیا ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کا دیوان بھی ”دیوان گویا“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جس میں غزل، قصیدہ، نعت، نظم، نوحہ اور سلام وغیرہ کے نمونے ملتے ہیں۔ نمونہ کلام ؎

وہ ایسا نہیں چپ رہے بات سن کر
کوئی اور ہوگا وہ گویا نہ ہوگا

غضب ہے جس کا پدر ہوئے ساقیٔ کوثر
کنارے نہر وہ ایک بوند آب کو ترسے

آپ کے دو بیٹے محمد احمد خاں اور محمد نسیم خاں تھے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ محمد نسیم خاں تعلقدار سہلامئو کے سلسلے میں ایک بھی شاعر یا ادیب نہیں ہوا اور محمد احمد خاں احمد (۱۹۰۳ - ۱۸۲۹) تعلقدار کسمنڈوی خرد کے سلسلے میں سب کے سب شاعر و ادیب ہوئے۔ آپ کے گیارہ بیویاں تھیں مگر ایک وقت میں چار سے زیادہ نہیں۔ ۱۷ (سترہ) بیٹے اور ۲۰ (بیس) بیٹیاں تھیں جن کے نام ”گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات“ (از ڈاکٹر ناہید عارف) میں صہ ۲۸۳ پر درج ہیں۔ جوش نے اپنی ”یادوں کی برات“ میں یہ تعداد ۱۱۲ (ایک سو بارہ) لکھی ہے یہ جوش کی بھول ہے۔

آپ نے شعر گوئی، علم دوستی، انگریز دشمنی، صف بندی اور شجاعت اپنے والد سے ورثہ میں پائی تھی۔ آپ بچپن ہی سے شاعر تھے اور والد سے اصلاح لیتے تھے۔ ؎

ہے جو گویا سے سخنور سے تلمذ احمد
کیوں نہ ہو ملک معانی میں اجارا میرا

آپ کا دیوان ”مخزن آلام“ ۱۸۹۰ء میں نامی پریس لکھنؤ سے چھپ چکا ہے

اس میں غزلیں، قصیدے، مرثیے، سلام اور سہرے وغیرہ ہیں۔ نمونہ کلام:-

شہر میں آئے تو جنگل کی ہوا سر میں بھری
لائی صحرا میں جو وحشت تو وطن یاد آیا

آپ کے ایک بیٹے امیر احمد خاں امیر (۱۸۸۶-۱۸۵۸) بھی صاحب دیوان شاعر ہوئے۔ باپ کے سامنے تقریباً ۲۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ آپ کا دیوان "گلشن خزاں" ۱۸۹۰ء میں چھپ چکا ہے۔ اس میں نعت، سہرے، قصیدے اور غزل کے نمونے موجود ہیں۔ نمونہ کلام:-

آیا خیال زندگی بے ثبات کا
دیکھا جو ہم نے آنکھ اٹھا کر حباب کو

محمد احمد خاں احمد کے دوسرے بیٹے بشیر احمد خاں بشیر (۱۹۱۴-۱۸۷۴) تھے۔ انکا بھی ایک چھوٹا سا دیوان "کلام بشیر" کے نام سے چھپ چکا ہے

انھیں کے بیٹے جوش ملیح آبادی ہیں۔ جوش کے علاوہ محمد احمد خاں احمد کے سلسلے میں وصل، شور، نثار، رئیس، شاد، اثر، منشور، اظہار، جلال، شمیم، جعفر، ناصر، ناہید، مائل، عصمت، عاطف، عبدالرزاق خاں اور احمد سعید وغیرہ آتے ہیں۔ آج تک اس خاندان میں ادبی خدمات کا سلسلہ پورے آب و تاب کے ساتھ جاری ہے

(۷) محمد علی (۱۹۵۹-۱۸۸۰) والد: چودھری احسان رسول تعلقہ: امیر پور (رودلی ضلع بارہ بنکی) انگریزی میں مہارت کی وجہ سے انگریزی حکام میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ انتہائی شگفتہ قلم تھے آپکی مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں:-

۱۔ کشکول محمد علی شاہ فقیر ۲۔ میرا مذہب ۳۔ گناہ کا خوف ۴۔ صلاح کار ۵۔ یادگار کرامت حسین ۶۔ تعزیہ داری ۷۔ اتالیق بی بی ۸۔ نقاد کے نقطے ۹۔ پردے کی بات ۱۰۔ گویا دبستاں کھل گیا۔

(۸) مذاق:- نام خان بہادر نواب احمد حسین خاں (؟ - ۱۸۴۵) والد: خاں بہادر شیخ دوست محمد تعلقدار بریاواں (ضلع پرتاپ گڑھ) آپ کی ادبی خدمات تعداد میں بہت زیادہ اور معیار میں بہت بلند ہیں۔ پہلے آپ کے دو شعری مجموعے "کلیات مذاق" اور "جذبات مذاق" چھپے۔ ایک مجموعہ ہندی مثلوں کا "ضرب المثل" چھپا۔ ایک ناول "عقد الجواہر" شائع ہوا۔ پھر کتابوں پر کتابیں چھپنے لگیں اور ہر کتاب اپنی جگہ ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی آخری اور معرکۃ الآرا تصنیف "تاریخ احمدی" ہے۔ آپ کے تصانیف کی تعداد بیالیس تک پہونچتی ہے جن کے نام تاریخ احمدی میں درج ہیں۔

(۹) مہر:- نام درگا پرشاد (۱۹۲۰-۱۸۴۶) والد: راجہ دھنپت رائے تعلقہ: سرون بڑا گاؤں ان کے مورث اعلیٰ رائے مکھن لال ۱۷۶۰ء میں اودھ آئے اور دربار اودھ سے وابستہ ہوگئے۔ ان کا خاندان ہمیشہ اسی دربار سے متعلق رہا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ مہر کو فارسی پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی آپ خط نستعلیق، خط نسخ اور خط شکست میں بھی لاجواب تھے۔

تصانیف:- ۱۔ ہسٹری آف انڈیا ۲۔ تاریخ اجودھیا ۳۔ تاریخ سندیلہ ۴۔ بوستان اودھ ۵۔ پند دل پسند ۶۔ مہابھارت کا منظوم نامکمل ترجمہ ۷۔ ہسٹری آف دی فرسٹ ورلڈ وار ۸۔ حدیقہ عشرت ۹۔ مثنوی ثمر الفت ۱۰۔ مثنوی مہر تاباں۔

آپ کے چھوٹے بھائی کامتا پرشاد نجم بھی اچھے شاعر تھے۔ آپ کے دو بیٹے سورج بہادر اور بخت بہادر بھی شاعر تھے۔

(۱۰) نواب:- نام راجہ نواب علی خاں (۱۹۶۹-۱۸۸۷) والد راجہ فضل حسین تعلقہ اکبر پور (سیتاپور) موسیقی میں تلمذ پنڈت وشنو نرائن بھات کھنڈے سے حاصل کیا۔ آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف "معارف النغمات" ہے۔ دوسرا حصہ بھی چھپ چکا ہے۔

یہ کتاب علم موسیقی میں انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ ایسی کتاب اردو میں دوسری نہیں چھپی۔ آپ ہی نے لکھنؤ میں ایک میوزک کالج کی بنیاد ڈالی جس کے آپ ہی پہلے صدر ہوئے۔

بہ حیثیت مجموعی تعلقداران اودھ نے دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے شعر و ادب کی خدمت کی۔

دس ریاستوں کے تعلقداروں کی ادبی خدمات کا ذکر اور ان کے اہل خاندان سخنوروں کے تخلص دیے گئے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ساٹھ (۶۰) تک پہنچتی ہے۔ بقیہ ریاستوں کے تعلقدار اور ان کے متعلقین جن کی ادبی خدمات میری گرفت میں آچکی ہیں ان کے نام معہ تخلص و تعلقہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ نواب سید جعفر علی خاں جعفر تعلقدار اہما مئو لکھنؤ ۲۔ نواب سید حسین علی خاں عرف رئیس آغا رئیس تعلقدار اہما مئو (لکھنؤ) ۳۔ رئیس کے بیٹے سید صادق علی خاں عرف جمشید آغا صادق ۴۔ نواب مرزا محمد حسین علی خاں سردار تعلقدار دھرورہ (لکھنؤ) ۵۔ نواب مرزا رضا حسین خاں مشہدی تعلقدار بہٹا (لکھنؤ) ۶۔ ان کے بیٹے نواب مرزا محمد تقی علی عرف لاڈلے نواب تقی ۷۔ انکے

بیٹے مرزا محمد سجاد حسین خاں عرف انور نواب انور ۸۔ ان کے بیٹے نقی حسین خاں عرف سرور نواب سرور ۹۔ سید مصحف حسین مشتاق تعلقدار مصطفی آباد (رائے بریلی) ۱۰۔ ان کے بیٹے سید نجم الدین نقوی نقوی ۱۱۔ دوسرے بیٹے سید رضی الدین نجم ۱۲ کیپٹن سید ضامن علی تعلقدار مصطفےٰ آباد (رائے بریلی) ۱۳۔ خان بہادر چودھری علی اختر اختر تعلقدار بلوا (سیتا پور) ۱۴۔ احمد سیتا پوری احمد تعلقدار مہیوہ (سیتاپور) ۱۵۔ خان بہادر سید مسعود حسن مسعود تعلقد جلال پور را اگر بدرگ (الحکیم پور) ۱۶۔ ان کے بیٹے مختار حسن مختار ۱۷۔ مختار کے بیٹے اختر علی نقوی اختر ۱۸۔ سید فضل رسول واسطی تعلقدار جلال پور (سندیلہ ہردوئی)۔ ۱۹۔ منشی سید فضل حسین شاعر تعلقدار جلال پور (ہردوئی) ۲۰۔ ان کے بیٹے منشی سید التفات رسول ہاشمی ۲۱۔ سید ذکی حیدر ظفر تعلقدار اناؤ ۲۲۔ خان بہادر سید احمد عباس سعید تعلقدار اناؤ ۲۳۔ سید یعقوب الحسن حسن و حسرت تعلقدار اناؤ ۲۴۔ راجہ سید احمد مہدی تعلقدار پیر پور ۲۵۔ راجہ سید بادشاہ حسین تعلقدار لور پور ۲۶۔ راجہ دگ وجے سنگھ تعلقدار بلرام پور تلسی پور (گونڈہ) ۲۷۔ سید غلام حیدر ضیغم تعلقدار علی نگر (جرول ضلع بہرائچ) ۲۸۔ سید ریاض علی ریاض تعلقدار علی نگر (جرول بہرائچ) ۲۹۔ حاجی سید سجاد حسین فائق تعلقدار برولی ہرچندا (بہرائچ) ۳۰۔ سید شاکر حسین شاکر تعلقدار برولی ہرچندا۔ ۳۱۔ ان کے بیٹے سید ناصر کاظم ناصر ۳۲۔ سید مظفر حسین طاہر تعلقدار علی نگر (بہرائچ) ۳۳۔ ٹھاکر محمد حسن یار خاں افسری تعلقدار عثمان پور (بارہ بنکی) ۳۴۔ ان کے تین بیٹے محمود مختار خاں محمود اور ۳۵۔ محمد مختار خاں محمد ۳۶۔ ٹھاکر احمد مختار خاں مختار ۳۷۔ حمید الدین خاں حمید تعلقدار عثمان پور (بارہ بنکی) ۳۸۔ سید محمد احمد زیدی حشم تعلقدار عثمان پور ۳۹۔ سید افتخار مہدی زیدی احمر تعلقدار عثمان پور ۴۰۔ سید محمد حاکم حاکم تعلقدار سرائے اسمٰعیل (بارہ بنکی) ۴۱۔ چودھری سید ارشاد حسین ارشاد نرولی (ضلع بارہ بنکی) ۴۲۔ چودھری سرفراز احمد گیسو تعلقدار ہرئی (بارہ بنکی) ۴۳۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر آفتاب احمد صبحی ۴۴۔ جاوید محبوب جاوید تعلقدار ہرئی ۴۵۔ چودھری محمد علی علی تعلقدار ہرئی ۴۶۔ سید معصوم علی بیدل تعلقدار پرائے (بارہ بنکی) ۴۷۔ سید محمد صادق بشر جامی تعلقدار پرائے ۴۸۔ سید محمد تقی شبر تقی تعلقدار پرائے (بارہ بنکی) ۴۹۔ مولانا سید محمد عابد بشر تعلقدار پرائے۔

فہرست بہت لمبی ہو رہی ہے۔ بس اب زید پور ضلع بارہ بنکی کے تعلقداروں کے تخلص دیکر قلم روک رہا ہوں۔ زید پور میں دو تعلقے تھے۔ ایک بڑے بھائی کے پاس ایک چھوٹے بھائی کے پاس۔ اس حساب سے وہاں چھوٹی سرکار اور بڑی سرکار بن گئی۔ ان تعلقداروں نے مرثیے، نوحے، غزلیں قصیدے تاریخیں، رباعیاں اور قطعے وغیرہ خوب کہے ہیں۔ ان دونوں سرکاروں کے تعلقداروں (حصے داروں) کی تعداد بہت ہے۔ لہٰذا ان کے صرف تخلص دئے جا رہے ہیں۔

۵۰۔ دل ۵۱۔ وصی ۵۲ قیصر ۵۳۔ قمر رضا ۵۴۔ خوشتر ۵۵۔ طالب ۵۶۔ حسن ۵۷ دلشاد ۵۸۔ سجاد ۵۹ جوشش ۶۰۔ محسن ۶۱۔ اثر ۶۲۔ صادق ۶۳۔ آقا ۶۴۔ اکرم ۶۵۔ قمر ۶۶۔ وفا ۶۷۔ ناز ۶۸۔ وقار۔

□□

فن طباعت کا آغاز وارتقاء ص ۳۵ کا بقیہ

میں بہت تھی اور ان کے قدردان بادشاہوں کے علاوہ علماء و امراء بھی تھے جن کے گرانقدر انعامات و اعزازات لکھنے والوں کے حوصلے بلند کرتے تھے۔ سلطان المطابع قائم ہوا تو اس وقت کتابت کرنے والوں میں مولوی ہادی علی اشک، منشی امیر اللہ تسلیم اور میر بندہ علی مرتعش جیسے ماہر خوشنویس کتابت کرتے تھے جو اس زمانے میں ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مطبع نول کشور قائم ہوا تو ہادی علی اشک پیرانہ سالی کے باوجود اس میں کام کرنے لگے۔ کلیات نظم غالب کی کتابت انھوں نے ہی کی تھی۔ ان کے شاگردوں میں منشی شمس الدین اعجاز رقم نے اس فن میں بہت شہرت حاصل کی۔ اعجاز رقم مطبع نول کشور میں کام کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔ اس وقت ہندستان کے مختلف مقامات پر جو اچھے خوشنویس موجود ہیں کسی نہ کسی واسطے سے ان کا تعلق اعجاز رقم کے سلسلے سے ضرور ہوگا۔

اصلاح سنگ، یعنی پتھروں پر چھپاں حروف کو درست کرنا اور معکوس نویسی کے فن کو لکھنؤ میں ترقی حاصل ہوئی۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ دونوں اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔

□□

رئیس آغا
ایڈیٹر: ہفت روزہ مجسم - ۹۵ مقبرہ گولہ گنج
لکھنؤ ۱۸

کمال الدین حیدر :: قلمی مخطوطہ اور مطبوعہ تاریخ اودھ

اودھ کے زیر موضوع تاریخی مخطوطہ کے بارے میں یا مطبوعہ تاریخ اودھ اور اس کے موٴلف یا مصنف سید کمال الدین حیدر کے سلسلے میں کچھ لکھنے سے پہلے تاریخ کی اس حقیقت اور المیہ کا بیان بھی بیحد ضروری ہے کہ دنیا کی ہر تاریخ میں تحریف ہوئی ہے۔ صدیوں کے طویل سفر کی گرد میں اٹے ہوئے واقعات، ہر صاحب قلم کا جدا انداز فکر اور سب سے بڑھ کر جو طاقت اثر انداز ہوتی ہے وہ حکومت وقت کی منشا و مرضی اور خوشنودی ہے۔ ایسا ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے کہ حکومتوں نے اپنے مفاد اور مطالب کے حصول کے لیے قلمکاروں کو بھی استعمال کیا اور عوام میں سے بھی بعض حضرات نے ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے قلم کو حکومت وقت کی مرضی کا تابع بنائے رکھا۔ اس کے برخلاف حق گوئی کے ساتھ اپنے قلم کا آزادانہ استعمال کرنے والے ہمیشہ حکومتوں کے شدید عتاب کا نشانہ بنتے رہے اور ان کے زبان و قلم پر حکومت نے کسی نہ کسی طرح اپنی گرفت کو قائم رکھا۔

ہندستان کی ماضی قریب کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسے انگریزی حکومت کے انداز فکر اور اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اگر حقائق اور واقعات کو ان کے حقیقی پس منظر میں دیکھا جائے اور ان کا تجزیہ کیا جائے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ حقیقی اور غیر جانب دار تاریخ کا لکھا جانا ایک ایسے عہد میں کیونکر ممکن تھا جس میں ایک ہی ملک کی ایک ہی رعایا پر دوہری فرمانروائی کارفرما تھی یعنی ایک طرف تو غیر ملکی غاصب سرکار انگلشیہ یعنی کمپنی بہادر اور دوسری طرف اودھ کے دیسی اور موروثی حکمراں، جن کی طرف کمال الدین حیدر نے اسی کتاب میں بعض مقامات پر لفظ "سرکارین" سے اشارہ کیا ہے۔

جہاں لوگ صاحب ریزیڈنٹ کو "بڑے صاحب" اور گورنر جنرل کو "نواب محتشم الیہ" لکھنے کے عادی اور پابند ہوں وہاں ایسی تاریخ کی تدوین جس میں حکومت کی مرضی کے خلاف حقائق کا برملا اظہار ہو، کس مورخ کے بس کی بات تھی، لیکن جہاں تک کمال الدین حیدر کی تالیف کردہ تاریخ اودھ "اور اودھ پر دستیاب دوسرے مورخین کی کتابوں کا تعلق ہے" کمال الدین حیدر ہی وہ واحد اور تنہا مورخ ہے جس نے ممکنہ طور پر کہیں کہیں بہت ہی چھوٹے سے جملے میں یا انتہائی ہوشیاری سے صرف ایک لفظ کے پردے میں حقیقتوں کا اظہار نہایت عالمانہ اور خوبصورت پیرایہ میں کیا ہے۔ بقول کمال الدین حیدر:

"ارباب سیر و تواریخ کو فقط ایسے اشارات کافی ہیں"

مثلاً نواب سعادت علی خاں اور ریزیڈنٹ جان بیلی کے تعلقات کی کشمکش کا اظہار اور انگریز ریزیڈنٹ کی چیرہ دستیوں پر تبصرہ آرائی کے لیے کیسا معنی خیز انداز بیان اختیار کیا ہے لکھتے ہیں:

"خلاصہ جناب عالی نے جو کچھ مدت ریاست میں عرق ریزی و جد و جہد کی، سب پر ظاہر ہے خصوصاً اس اپنے بے اختیار ہونے میں جتنا کہ صاحب اختیار سے نہ ہو سکا اس عہد دولت میں سوال و جواب مقدمات سرکارین تحریر پر رجہ پیام پر موقوف رہا...... کسی صاحب ریزیڈنٹ اور جناب عالی سے جیسا کہ چاہیے موافقت نہ ہوئی اور کرنل جان بیلی صاحب سے جو ۹ برس کی مدت میں گزرا ظاہر ہے

پکچر گیلری حسین آباد لکھنؤ

دلکشا باغ لکھنؤ

بیبیا پور کوٹھی لکھنؤ

روضۂ
کاظمین
منصورنگر
لکھنؤ

بیگم حضرت محل کی یاد م
تعمیر کی گئی ایک عمار
واقع حضرت محل پارک، لکھنؤ
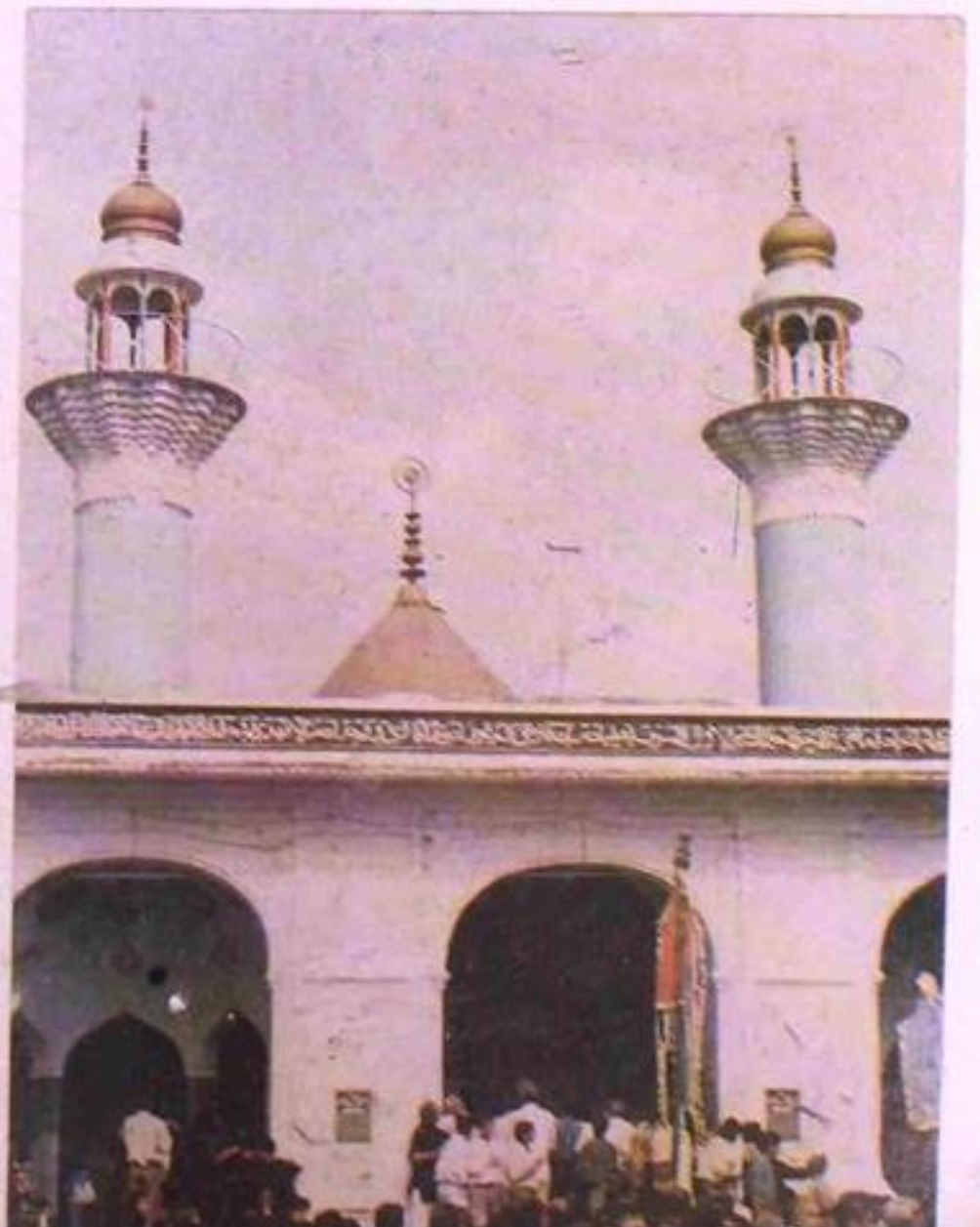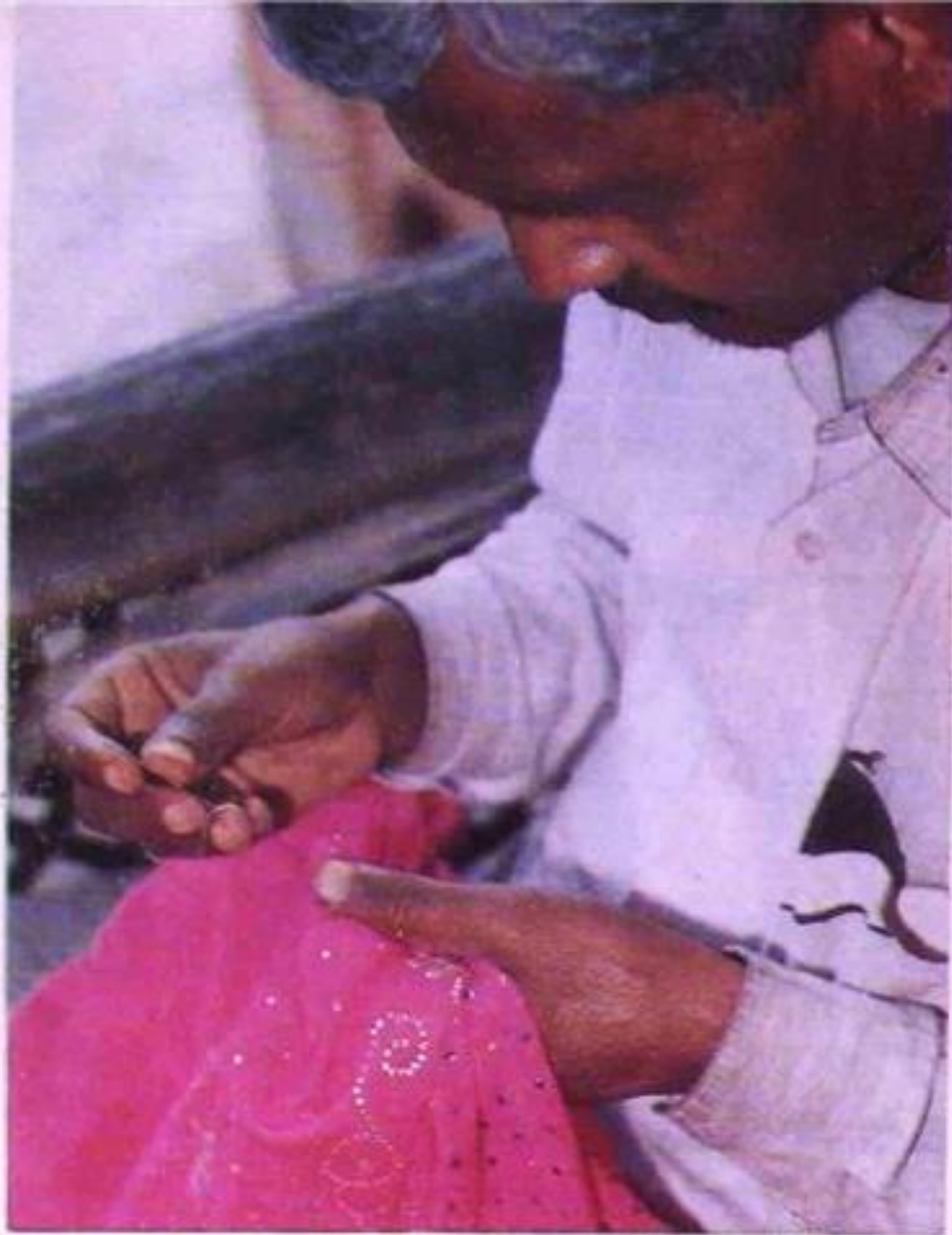
کامدانی کا کام کرتے ہوئے
اودھ کا ایک باشندہ
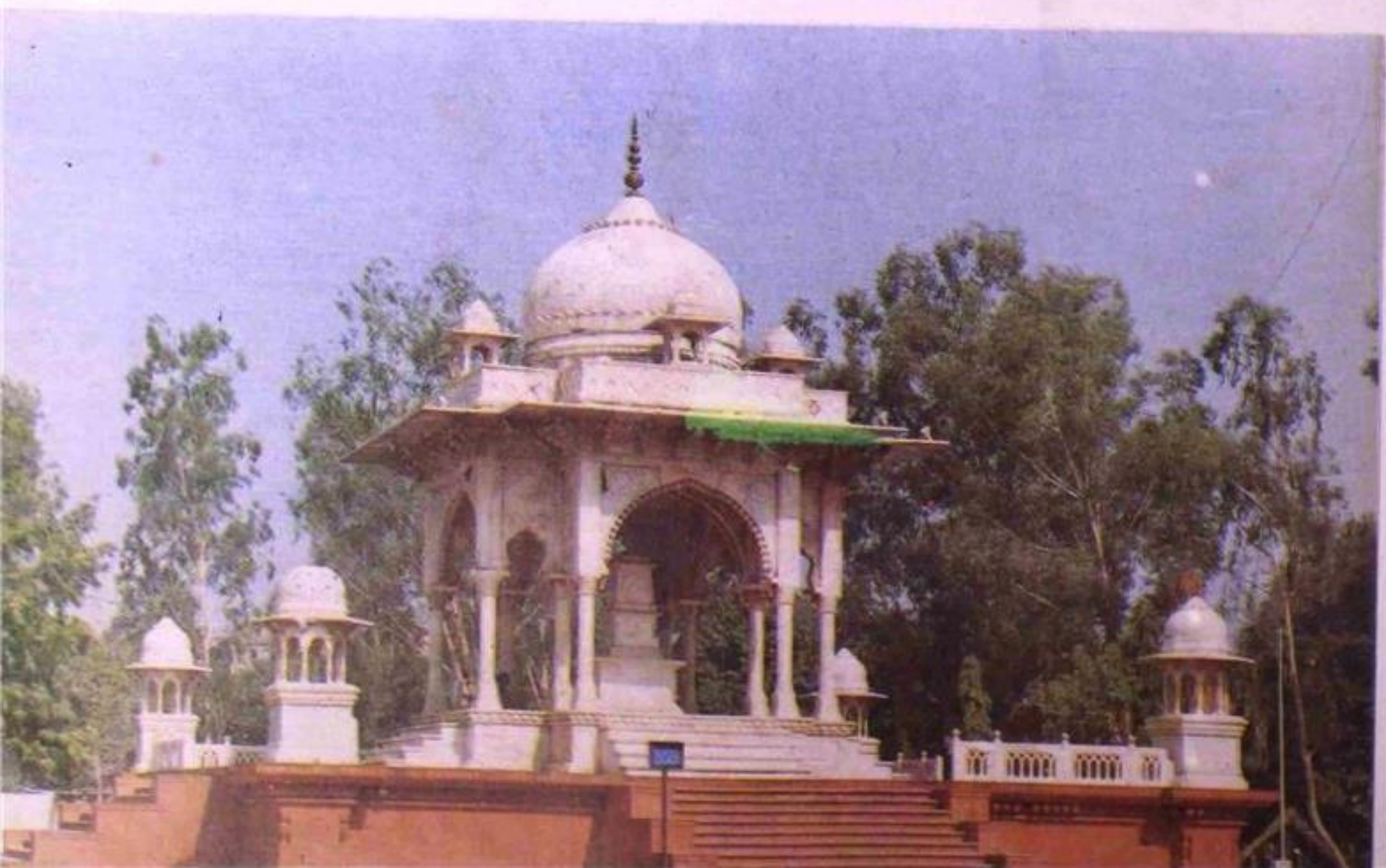
لکھنؤ
کی
ایک
شام

تقریباً
ایک ہزار سال پرانا
من کا میشور مندر
ڈالی گنج، لکھنؤ
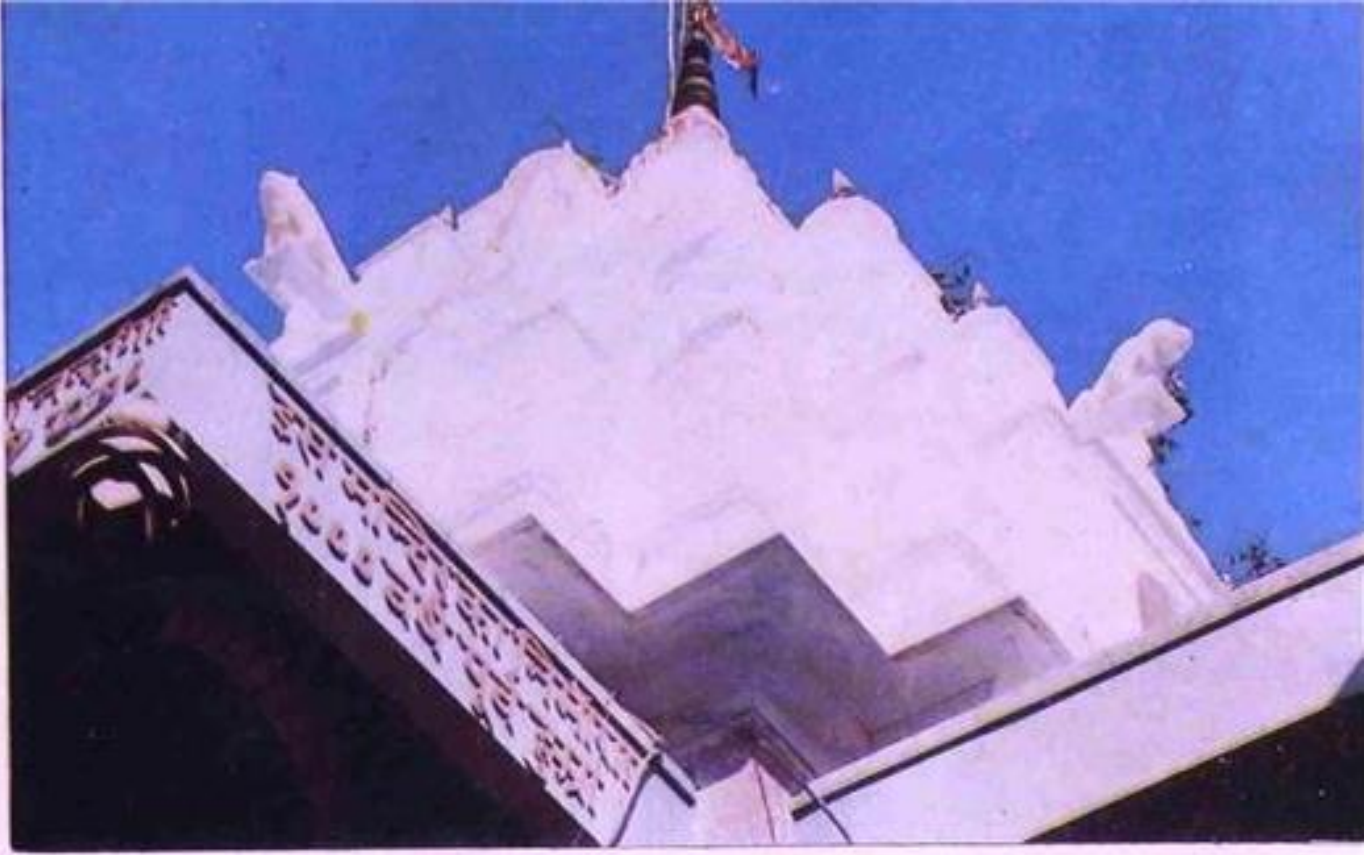
مزار
مولانا عین القضاۃ رح
مدرسہ فرقانیہ
لکھنؤ

کرائسٹ چرچ
(جی پی او کے سامنے)
حضرت گنج لکھنؤ

کہ ہر امر جزوی و کلّی میں بہت سے امور خلاف قانون عمل میں آئے اس کی تفصیل کہاں تک کی جائے ..... اوس زمانے میں زرلیسی حمایت سے بہت سے اصحاب الیمین نے اصحاب الشمال ہو کر اپنے مرکز حق سے تجاوز کر کے راہ منحنی اختیار کی تھی اور بنام نامی خیر خواہان کمپنی ہونا اپنا مزید تفاخر سمجھتے تھے ....

خلاصہ توضیح ان حکایات کے واسطے ایک دفتر چاہیے۔ اس کے اشارات کافی ہیں جب ایک وقت ایسے حال پر گزری، مدت ریزیڈنسی کرنل جان بیلی بہادر کو طول ہوا۔ ہر صاحب فہم متحیر اور حیران تھا کہ آخر اس کا انجام کار کیا ہوگا۔"

اسی عنوان کے ذیل میں کمال الدین حیدر نے نواب سعادت علی خاں بہادر کی ہلاکت کا ذمہ دار انگریز ریزیڈنٹ جان بیلی کو قرار دیتے ہوئے سازش اور سازش کے آلہ کار کی نشاندہی ایک لفظ کے پردے میں اس طرح کی ہے:

" رمضان علی خاں اشرف الدولہ بہادر مہتمم دیوان خانہ اور معتمد خاص جناب عالی جلد دوڑے اور کرنل بیلی کو یہ "مژدۂ مرگ" سُنایا اور اپنا استحقاق خدمت ثابت کیا، اور درشن سنگھ جس کا خطاب غالب جنگ ہوا تھا یا محمد غلامی نے دوڑ کر نواب غازی الدین حیدر خاں کو اس سانحہ کی خبر پہنچائی۔" [1]

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں دیکھا جائے تو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں کہ لفظ "مژدہ" خوش خبری کو کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے لئے نواب سعادت علی خاں کی موت خوشی اور اطمینان کا باعث بن سکتی تھی انھیں کے لئے ایک انتہائی الم انگیز اور غیر متوقع "سانحۂ مرگ" جس نے موقع پر موجود تمام حاضرین کو سکتہ میں ڈال دیا تھا "مژدۂ مرگ" بن سکتا تھا۔

اسی طرح تاریخ اودھ جلد اول موسومہ "سوانحات سلاطین اودھ" کے سبب تالیف میں مورخ کا یہ جملہ کہ "جب سر ہنری الیٹ لکھنؤ تشریف لائے" یا یہ جملہ کہ "چنانچہ عنوان تحریر کتاب موافق دستور انگریزی کیا" اور تاریخ اودھ جلد دوم موسومہ "قیصر التواریخ" کے صفحہ ۱۶۱ پر "برگشتگی تقدیر این عاصی پُر معاصی اور موقوفی عملہ رصد خانۂ سلطانی" کے عنوان سے لکھی گئی عبارت کا یہ جملہ کہ "بسر اوقات مع عیال اطفال ۱۰ برس تک توکل پر رہی" وغیرہ وغیرہ محققین کے لئے بجائے خود ایک موضوع فکر اور دعوتِ تحقیق ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ تاریخ اودھ کے ایسے معروف مؤرخ کے حالات و کوائف کے ذیل میں اب تک بہت ہی کم معلومات دستیاب ہیں۔ کچھ معلومات منشی نول کشور پریس کے سپرنٹنڈنٹ مولوی اسمٰعیل نے مطبوعہ تاریخ اودھ (۱۸۷۹ء) کے خاتمۃ الطبع میں مہیا کی ہیں۔

کمال الدین حیدر کے سلسلے میں نول کشور پریس لکھنؤ کے مہتمم مولوی محمد اسمٰعیل تاریخ اودھ جلد دوم کے خاتمۃ الطبع میں تحریر کرتے ہیں:

" اس کتاب کے مصنف سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی علوی نہاد لکھنوی نژاد، متوکل بمشیت رب قدیر عرف سید محمد میر زائر متکی کربلائے میر خدا بخش، ہیں نہایت عالی خاندان والا دودمان مولد و مسکن آبادی کرام حضرت مصنف کا تون طیس کونہ آباد منمقات مشہد مقدس ہے، آپ کے اجداد کرام میں میر عماد صاحب نہایت مشہور شخص گزرے جن کے علم و فضل کا شہرہ شرق سے غرب تک مشہور ہے خامہ مقطوع اللسان اون کی تحریر اوصاف میں معذور ہے کہ وہ اونکے اوصاف سے واقف ہیں کہ سید جلیل فاضل نبیل مقرب خاص سلاطین و امرا نامدار تھے اور فن خوش نویسی خاص نستعلیق میں شہرہ آفاق اور اپنے زمانے میں عدیل و نظیر نہ رکھتے تھے چنانچہ یہ نقل مشہور ہے کہ حضرت شاہ عباس بادشاہ اصفہان نے میر موصوف سے فرمایا کہ محمود غزنوی نے صلہ تصنیف شاہنامہ فردوسی طوسی میں ایک اشرفی شعر انعام فرمایا تھا میں تم کو بصلہ کتابت ایک بیت کی ایک اشرفی دوں گا۔ میر ممدوح نے قبول کیا اور تحریر کتابت شروع کی۔ چنانچہ عرصہ قلیل میں دو ہزار بیت تحریر کیے۔ جب بادشاہ نے طلب فرمایا او سیقدر

تحریر گزرانی۔ بادشاہ بہت پر غضب ہوئے اور فرمایا ان سے زرِ انعام جو ملا ہے پھیر لو۔ میر ممدوح نے ہر فرد کو مقراض کر ڈالا۔ جب یہ خبر نقادان قدردان کو پہونچی مغتنمات سمجھ کر ہر بیت کو پانچ اشرفی سے دس تک دے کر بلا تاخیر خرید لیا میر صاحب نے جس قدر خزانۂ عامرہ شاہی سے لیا تھا داخل کیا۔ بادشاہ یہ خبر سُن کر زیادہ غضب ناک ہوئے اور انگوٹھے قلم کرنے کا حکم دیا چنانچہ اسی صدمے سے روز سوم میر صاحب نے انتقال کیا۔ بعد ازاں پھر بادشاہ کو بہت تاسف ہوا مگر کیا فائدہ قضائے الہٰی جاری ہو چکی تھی۔

...... حضرت مصنف عہد نواب غازی الدین حیدر میں بزمانۂ ترقی و عروج مرزا حاجی و محمد آغا زین علی خاں ملازم سرکار ہوئے ...... عہد دولت غازی الدین حیدر ہی میں تحصیلِ علم انگریزی کی شروع کی۔ اوس زمانے میں ہندوستانی انگریزی دان شہر میں دو چار ہی شخص تھے۔ عہد سلطنت حضرت نصیر الدین حیدر میں زمانۂ عروج نواب قدسیہ محل صاحبہ و در دورہ نواب روشن الدولہ بہادر میں واسطے تعلیم انگریزی و آتالیقی میرن صاحب صاحبزادۂ قدسیہ محل صاحبہ کے مقرر ہوئے اوسی عہد میں بزمانۂ نیابت نواب معظم الدولہ حکیم مہدی علیخاں جب بنائے اسکول انگریزی در رصدخانہ سُلطانی قائم ہوئی مصنف صاحب ممدوح نے علم ریاضی و فلاسفی و علم طبیعات کی تحصیل شروع کی اور کتاب نیچر فلاسفی یعنی طبیعات کا جس میں مختصر پانچ رسالے نجوم اور ہوا پانی وغیرہ کے تھے اُردو میں ترجمہ کیا۔ بعدہٗ رسالہ لارڈ بروہم صاحب کا ترجمہ اُردو میں لکھا (اس کے علاوہ) اکثر رسالہ علمی انگریزی کے ترجمہ اُردو میں کر کے کلکتہ، آگرہ، شاہجہاں آباد بھیجدیتے تھے اوس کے صلے میں انعام سرکار سے ملتا تھا۔ اوسی عہد میں جب ولکاکس صاحب مہتمم رصد خانہ سلطانی ہوئے مصنف بھی رصد خانہ میں بمواجب سو روپیہ ماہواری ممتاز رہے۔ الغرض اوسی زمانہ میں ۱۹ رسالے علمی انگریزی سے اُردو میں ترجمے کیے۔ مثل رسالہ آلات جر ثقیل۔ رسالہ آلات آب وغیرہ رسالہ علم ہیئت۔ رسالہ علم ہوا۔ رسالہ علم مناظرہ۔ قصہ راسلس ڈاکٹر جانسن صاحب رسالہ مقاصد علوم صدر الصدور لندن لارڈ بروہم صاحب رسالہ حرارت۔ رسالہ ہیئت ڈاکٹر برنکلی صاحب۔ رسالہ معرفت طبیعی ہیلی صاحب۔ رسالہ آلات رصدیہ سیمسن صاحب رسالہ علم مقناطیسی۔ رسالہ علم کیمسٹری۔ رسالہ قوانین دستور العمل سلطنت لندن۔ رسالہ میل مرکزی ارل صاحب مہتمم رصد خانہ لندن۔ تواریخ مملکت اودھ فارسی انگریزی ترجمہ کرنیل چیمبرلین صاحب۔ رسالہ کالوانزم رسالہ جغرافیہ ان رسالوں میں سے اکثر مطابع کلکتہ و شاہجہاں آباد و اکبر آباد و مطبع سلطانی لکھنؤ میں طبع ہوئے چنانچہ عہد حضرت نصیر الدین حیدر بہادر سے تا زمانہ حضرت سلطان زمان امجد علی شاہ رصد خانہ سلطانی میں منصوب رہے، عہد نیابت امین الدولہ بہادر میں ہمراز تھے۔ خلوت میں صلاح و مشورہ رہا کرتا تھا اوسی زمانے میں حضرت مصنف کربلا میں جا کر دس روز تک قیام کرتے تھے مجلس عزائے امام علیہ السلام ولطف مجاورت و عبادت خدا میں مصروف رہا کرتے تھے تیاری سبیل کی ابتدا آپ ہی کی ذات سے ہوئی اور مجلس اما مباڑہ آغا باقر بھی آپ نے برپا کی۔

عہد سلطنت حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ میں جب ولکاکس صاحب مہتمم رصد خانہ سلطانی نے انتقال کیا اور انتظام وہاں کا بسبب رحلت صاحب موصوف کے ڈانواڈول ہوا، بمشورۂ میجر برڈ صاحب اسسٹنٹ اول صاحب ریزیڈنٹ بہادر بزمانہ نیابت علی نقی صاحب تخفیف عملہ رصد کی تجویز ہوئی چنانچہ کچھ عملہ برطرف ہوا لیکن حضرت مصنف مع کچھ عملے کے بحال رہے اور مشاہدات رصد خانہ بدستور جاری رہا ....

اوسی زمانے میں حسب الایمائے ایلیٹ صاحب بہادر گورنمنٹ ہند کے تواریخ مملکت اودھ فارسی اور اُردو میں تالیف

کی اور تقویم سال نوروز بھی بطرز جدید موافق دستور و طرز انگریزی لکھی اور سرکاری مطبع میں چھپ کر جا بجا شہر میں تقسیم ہوئی۔ الغرض اس تواریخ کی خوب شہرت ہوئی شدہ شدہ حضرت سلطان عالم کے حضور میں اس کا تذکرہ ہوا۔ حضور نے طلب فرما کر ملاحظہ فرمائی۔ عہد حضرت مکان تک کا حال ملاحظہ فرما کر بہت خوش ہوئے۔ جب اپنی سلطنت کے حالات ملاحظہ فرمائے چوں کہ مصنف نے باادائے فرض وقائع نگاری جملہ حالات بلا رو رعایت تحریر کیے تھے، بادشاہ کو ناگوار گزرا۔ خلاصہ یہ کہ نواب صاحب سے برطرفی عملہ رصد خانہ کا حکم فرمایا۔ حضرت مصنف بھی خانہ نشین ہوکر مہمان در سید الشہداء علیہ السّلام ہوئے یعنی کربلا میں رہنا اختیار کیا۔ اس عرصہ میں حوادث روزگار و انقلاب زمانہ سے کارخانہ سلطنت اودھ بھی درہم برہم ہوگیا۔ بعد ازاں فساد بلوہ لکھنؤ ہوا۔ حضرت مصنف وہیں کربلا ہی میں مقیم رہے بعد تسلط تقرر پنشن کے لیے سرکار انگریزی میں تحریک ہوئی اکثر صاحبان انگریز پنشن کے باب میں ساعی ہوئے چنانچہ کرنل چیمبرلین صاحب سابق سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ نے بھی صاحب چیف کمشنر بہادر اودھ سے عرض کیا اور بہت اشتیاق سے اس تواریخ اودھ کا ترجمہ انگریزی میں خود فرمایا۔ آخرش بہ تقریب ڈپٹی مرزا عباس بیگ صاحب مرحوم رسالجات علمی مترجم حضرت مصنف اور یہی تاریخ مملکت اودھ جنرل بیرو صاحب کے حضور میں پیش ہوئی۔ صاحب ممدوح نے سن کر بہت تعریف کی اور بکمال اشتیاق مصنف صاحب سے ملاقات فرمائی اور تقرر پنشن کے لیے رپورٹ بحضور گورنر جنرل بہادر بھیجی چنانچہ کل امر حسب مدعا تھا۔ چند عرصے کے بعد پیشگاہ نواب ممدوح الشان سے پچاس روپیہ ماہواری کی پنشن مقرر ہوگئی ....

مصنف ممدوح نے نہایت تحقیق و تنقیح سے اس تواریخ کو مکمل تالیف کر کے دو جلدوں پر منقسم کیا۔ جلد اوّل میں حالات تاریخی وزراء و سلاطین اودھ کے بسلسلہ ازواج و اولاد خاندان عالی شان از عہد نواب سعادت خاں برہان الملک تا زمان امجد علی شاہ مسطور ہیں اور دوسری جلد میں احوال تخت نشینی حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ و سوانحات انقلاب سلطنت و ذکر ایام غدر و حکومت مصنوعی مرزا برجیس قدر و دیگر کوائف متعلقہ بلوہ و فساد ہندوستان مرقوم ہیں و نقشہ ملک اودھ و شہر لکھنؤ و تصاویر وزراء و شاہان اودھ و اہل کاران و معتمدان سلطنت نہایت ترتیب کے ساتھ اپنے اپنے مواقع پر نصب کی گئی ہیں۔ الغرض یہ کارنامہ وقائع اودھ بحضور عالیجناب ہز ایکسی لنسی مہاراجہ سر دگبجے سنگھ بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی والی بلرامپور و تلسی پور اودھ پیش ہوا مہاراجہ صاحب بہادر ممدوح نے بکمال قدردانی نہایت پسند فرمایا اور حکم محکم صادر ہوا کہ یہ شاہد زیبا حلیۂ طبع سے آراستہ ہوکر جلوہ گر ہو کہ اوسکے مطالعہ سے صاحبانِ تواریخ دوست حظ وافر اوٹھائیں فائدہ متکاثر پائیں .....

..... جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر جلوہ ظہور پایا.... فہرست انگریزی و فارسی سے استخراج حالات میں نہایت تسہیل ہوئی مختصر تفصیل ہوئی ماہ دسمبر ۱۸۷۹ عیسوی میں شاہد رعنا نے شہرت اشاعت پائی سخن سنجان افسانہ دلفریب کو ایک مرقع صورت حال بے طول مقال ہاتھ آئے گا جو مشاہدہ کرے گا لطف بے اندازہ پائے گا امید کہ مقبول انام ہو منظور ہر خاص و عام ہو۔ فقط ” ؎۳

مندرجہ بالا حوالے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کمال الدین حیدر نہ صرف یہ کہ صاحبان کمال پر مشتمل ایک اعلیٰ خاندان کی فرد تھے بلکہ خود بھی مختلف علوم کی وسیع علمی استعداد رکھنے والی اہم شخصیت کے مالک تھے لیکن تاریخ اودھ کی تصنیف کے بعد بحیثیت مورخ ان کا نام شہرتِ عام بن کر رہ گیا۔
مذکورہ کتاب اودھ کی سلطنت کے تفصیلی حالات پر ایک مستند دستاویز

کی حیثیت سے مورخین کا موضوع رہی ہے جس کا سرسری مطالعہ بھی پڑھنے والے پر سب سے پہلے یہ تاثر قائم کر دیتا ہے کہ مورخ انگریزی حکومت کا خیر خواہ اور انگریزوں کا پرستار رہا ہے۔ انگریزوں کے اشارے پر اصل واقعات کو توڑ مروڑ کر حقائق کو چھپانے کی کتنی زبردست کوشش کی گئی ہے۔ اس گنجلک تواریخ اودھ کو منظر عام پر لانے والے سر مہاراجہ دگ وجے سنگھ آف بلرامپور بہ تحقیق انگریزی حکومت کے بہت ہی بڑے وفادار اور انگریزوں کے خیر خواہ شمار ہوتے تھے۔ مذکورہ تاریخ اودھ پر انھیں مہاراجہ سر دگ وجے سنگھ نے ایک دھمکی آمیز تقریظ بھی تحریر فرمائی ہے۔ تقریظ کے اختتام پر مہاراجہ صاحب فرماتے ہیں:

"ازانجا کہ ہر کاتب بعلم خود جہاں تک دریافت کر سکتا ہے اسی کو مقرون حق صداقت سمجھتا ہے اور معرض تحریر میں لاتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر کسی مقام پر وہ خود شریک رہا ہو یا اسی کے مشورہ پر کاربندی ہوئی ہو۔ اس نظر سے اگر کسی صاحب نے نزدیک و دور دوسرے طور پر سنا ہو، تو جب تک اس کی تصدیق کی وجہ ثبوت کافی اس سے زیادہ نہ ہو زبانِ اعتراض کو تاہ رکھیں گے دراز نہ فرمائیں گے۔"

تاریخ گواہ ہے کہ حکومت جب کسی کو "زبان درازی" کا مجرم قرار دیتی ہے تو اس کی زبان گدّی سے کھینچ لی جاتی ہے۔ اس طرح زبان و قلم پر پہرے لگا کر تواریخ اودھ کے اجرا کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

مہاراجہ دگ وجے سنگھ کی اس تصدیق کی روشنی میں کہ مصنف مذکور نے اسی تصنیف حکام حال صدر لکھنؤ کی خدمت میں پیش کی تھی، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۷۹ء تک کی درمیانی طویل مدت میں کمال الدین حیدر کی جانفشانی سے لکھی گئی تاریخ اودھ کب مکمل ہوئی اور کب حکام صدر لکھنؤ کی خدمت میں پیش کی گئی؟ حکام نے کیا جواب دیا اور کن مراحل سے گزر کر بتیس برس بعد طباعت کی منزل تک پہونچی؟ اس سلسلے میں کوئی واضح عبارت مذکورہ تاریخ اودھ کی دونوں جلدوں میں نہیں ملتی۔

ایسے موقع پر یہ انکشاف بے محل نہ ہوگا کہ سید کمال الدین حیدر نے اپنی تصنیف کردہ تاریخ اودھ کا مسودہ جو دو جلدوں پر مشتمل تھا حکام صدر لکھنؤ کی خدمت میں ۱۸۶۰ء میں اجازت طبع کی درخواست کے ساتھ پیش کیا تھا جسے ۱۸۶۱ء میں ایک مشروط حکم کے ساتھ سید کمال الدین حیدر کو حکام صدر نے واپس کر دیا۔ سرکاری حکم میں کہا گیا کہ:

"کمال الدین حیدر کے تئیں تواریخ واپس کر دی جائے اور آگاہ کر دیا جائے کہ اکثر مقاموں پر تاریخ ساتھ خیر خواہی کے نہیں ہوئی ہے۔ لیکن وہ چھاپ سکتے ہیں۔ مناسب ہے کہ اول چھپی جلد واسطے ملاحظہ کے مع تحریر قلمی اس محکمہ میں پیش کرے اور تا حکم ثانی اور نہ چھاپے۔ فقط"

(دستخط انگریزی)

وہ قلمی نسخہ جو سید کمال الدین حیدر نے اجازتِ طبع کے لئے مشروط حکم کے ساتھ حکام صدر سے واپس لیا تھا۔ راقم الحروف کے پاس موجود و محفوظ ہے۔ مذکورہ قلمی دستاویز کی عبارت اور مواد کا موازنہ راقم الحروف نے مطبوعہ "سوانحات سلاطینِ اودھ" اور "قیصر التواریخ" سے کیا تو انگریزی سرکار کے اس حکم کی عبارت (آگاہ کر دیا جائے کہ اکثر مقاموں پر تاریخ ساتھ خیر خواہی کے نہیں ہوئی ہے) کا حال منکشف ہوا یعنی مطبوعہ تواریخ میں سے ایسا تمام مواد جو صریحاً انگریزی حکومت کے خلاف تھا، خارج کر دیا گیا ہے اور بیشتر مقامات کی عبارت کو توڑ مروڑ کر واقعات کی شکل و صورت بالکل بدل ڈالی گئی ہے۔ اکثر عبارت کا رُخ اپنی تعریف کی طرف موڑ لیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مطبوعہ تواریخ اودھ کا مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ تاثر قائم ہو جاتا ہے کہ کمال الدین حیدر مرحوم نے تواریخ اودھ کی تصنیف کے ذریعہ انگریزی حکومت کی خوشامد اور خیر خواہی کا فرض انجام دیا ہے۔ حالانکہ کمال الدین حیدر مرحوم کی مذکورہ اصل دستاویز کی روشنی میں ایسی تمام بدگمانیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے اور انگریزی حکومت کی چالبازیوں کا پردہ بھی چاک ہو جاتا ہے۔ سید کمال الدین حیدر مرحوم مصنف تاریخ اودھ کے ان تاثرات کی ایک جھلک جو موصوف کی قلمی دستاویز میں موجود ہے اور جنھیں مطبوعہ "قیصر التواریخ" سے حذف کر لیا گیا ہے، ملاحظہ کیجیے۔ سلطان عالم واجد علی شاہ سے بہ جبر اودھ کی سلطنت چھین لیے جانے کی کارروائی کے بارے میں کمال الدین حیدر یوں رقمطراز ہیں:

"اب طرفہ ماجرا ہے۔ بجرد دیکھنے مضمون اشتہارات

اور معطل ہونے بادشاہ کے تمام کارندوں کو چاہیے کہ سب رعایا، غرباء اور ملازم اگر درحقیقت برطبق مضمون اشتہار نالاں اور گرفتار مصائب، کے ہوتے تو راضی اور شادماں ہوکر شکر گزار اور مداح انگریزی سرکار کے ہوتے لیکن برعکس اس کے سب رعایا، غربا اور ملازم بلکہ قیدی جو قید سے چھٹ گئے ہیں نالاں اور فریاد کناں ہیں کہ ہمیں وہ قید اور گرفتاری پسند اور قبول تھی ۔ عہد بادشاہ رحمت مجسم میں سب شروں سے محفوظ ہوکر اپنے حال میں خوش تھے اب اس عمل میں رہائی کو اشد قید جانتے ہیں کہ کہیں روٹی نہ ملے گی، پس جب حال قیدیوں کا جو چھٹ گئے ہوں یہ ہو تو کیف حال خلائق کہ گھر گھر کوچہ بکوچہ حسرات ماتم و بکا برپا ہے۔"[۲۵]

اسی واقعہ انتزاع سلطنتِ اودھ کے بارے میں موصوف نے تحریر کیا ہے:

"مؤلف کتاب کہتا ہے کہ مدت حکومت سلطنت صاحبان عالیشان کو آج ایک سو باون برس کا عرصہ گزرا، پہلے صوبہ بنگال اوڈیسہ اور بہار ۸ کروڑ روپے کا ملک سرکار کے قبضے میں آیا بعد اس کے تمام ہندوستان رفتہ رفتہ داخل ممالک محروسہ سرکار ہوتا چلا آیا، لیکن یہ کسی نے نہ سنا اور دیکھا ہوگا کہ حال قلب تمام ہندوستان بلکہ تمام عالم کا ادنیٰ سے اعلیٰ اس طرح سے متغیر اور دہل گیا ہو یہ امر تو فقط خدا کی طرف سے ہے اور اسے کیا کہیے اور کیوں کر دلوں کو تسکین دیجیے امر اختیاری نہیں ہے۔"[۲۶]

اب ملاحظہ فرمایئے سبب تالیف کے اس جملے کی حقیقت جو مذکورہ قلمی مخطوط اور مطبوعہ تاریخ اودھ (۱۸۷۹ء) دونوں ہی میں پایا جاتا ہے: "چنانچہ عنوان تحریر کتاب موافق دستور انگریزی کیا۔" حقیقتاً مذکورہ قلمی مخطوط میرے پیش نظر نہ ہوتا تو شاید اس جملے کا رمز آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔

دراصل اودھ پر قبضے کے بعد عوام پر انگریزی زبان مسلط کرنے کے ابتدائی اقدامات میں انگریزی سرکار کا طریقۂ کار یہ تھا کہ سرکار کی سرپرستی یا سرکاری امداد سے کسی بھی زبان میں چھپنے والی کتاب کے ٹائٹل صفحہ پر کتاب کا نام یا عنوان "رومن زبان" میں لکھے جانے کی پابندی تھی۔ ثبوت کے لئے انگریزی کے باقاعدہ رواج پانے سے قبل کے انگریزی عہد کی شائع شدہ کتابوں میں اس شرط کی پابندی کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے چنانچہ کمال الدین حیدر نے بھی جب اپنی کتاب تاریخ اودھ کی دونوں جلدیں اودھ پر انگریزوں کی باقاعدہ عملداری کے تین برس بعد درخواست طبع کتاب کے ساتھ ۲۶ جون ۱۸۶۰ء کو حکام صدر لکھنؤ کی خدمت میں پیش کی تھیں تو اس شرط کی پابندی کو ملحوظ رکھا تھا۔ جلد اول کے ٹائٹل پر کمال الدین حیدر نے انگریزی میں درج ذیل عبارت تحریر کی ہے:

BRIEF HISTORY OF OUDE INTO URDU INTWO VOLS
1st FROM THE COMMENCEMENT TILL THE REIGN OF
UMJAD ALLY SHAH KING OF OUDE
BY SYED KAMALOODEN HYDER MOONSHI AND
TRANSLATOR TO THE LATE COLL. RE WILCOX
SUPDT OF THE LATE OBSERVATORY LUCKNOW 1859

جس کا اردو ترجمہ مختصر تاریخ اودھ ہوتا ہے مزکر "سوانحات سلاطین اودھ" بر نام مہاراجہ درگبجے سنگھ آف بلرامپور کا عطا کردہ معلوم ہوتا ہے۔ مذکورہ "تاریخ اودھ" کی دوسری جلد جسے مہاراجہ صاحب نے "قیصر التواریخ" کے نام سے موسوم کیا ہے اس کا نام کمال الدین حیدر نے "تقویم حالِ سلطنتِ صوبۂ اودھ" رکھا تھا۔ قلمی مخطوط کی دوسری جلد کا سرورق بھی مذکورہ پابندی کا مظہر ہے جس پر انگریزی میں یہ عبارت درج ہے:

TAKVEEM HALE SULTANATE SOBIA OUDE INTO URDU
- 2nd VOLS PARTICULAR AFFAIRS REIGN OF
SOOLTAN ALLUM WAJID ALLY SHAH KING OF OUDE
BY SYED KAMALOODEN HYDER MOONSHI AND
TRANSLATOR TO THE LATE COLL WILCOX SUPT OF
THE LATE OBSERVATORY LUCKNOW 1859

دراصل دوسری جلد واجد علی شاہ کے عہد سلطنت کے احوال پر مشتمل ہے اور واجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز کا سنہ ۱۸۴۷ عیسوی ہے۔ "تقویم حال سلطنت صوبۂ اودھ" سے واجد علی شاہ کے سنہ جلوس کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ کمال الدین حیدر کی تاریخ اودھ کی جلد اول کا آغاز چند اشعار پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ سے ہوا ہے۔ یہ قطعہ تاریخ قلمی مخطوط اور مطبوعہ دونوں

ہی کتابوں میں موجود ہے۔ "تقویم حال سلطنت صوبہ اودھ" مذکورہ جلد اول کے قطعہ تاریخ کا آخری مصرعہ ہے۔ کمال الدین حیدر نے اسی مصرعہ کو جلد دوم کا عنوان قرار دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ سرہنری الیٹ واجد علی شاہ کے عہد سلطنت ہی میں آیا تھا اور اسی نے تاریخ اودھ لکھے جانے کی فرمائش کی تھی۔ قلمی مخطوطے کے مطابق تاریخ اودھ کی مذکورہ دونوں جلدیں ۱۸۵۹ء میں مکمل ہوگئیں۔ سبب تالیف میں درج عبارت کی روشنی میں یہ دونوں جلدیں اُردو اور فارسی میں تیار کر کے جون ۱۸۶۰ء میں درخواست طبع کتاب کے ساتھ انگریزی سرکار کے سامنے پیش کی گئیں جنھیں اکتوبر ۱۸۶۱ء میں چیف کمشنر کے ایک مشروط حکم کے ساتھ کمال الدین حیدر کو واپس کیا گیا تھا کہ تاریخ اودھ میں جو باتیں یا واقعات انگریزی سرکار کی نظر میں خیر خواہی کے خلاف درج کر دیئے گئے ہیں انھیں وہ اپنی کتاب سے خارج کردیں گے۔ لیکن سید کمال الدین حیدر مرحوم مختلف علوم پر حاوی ہندستانی وضع قطع رکھنے والی ایک باکردار شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے ایک غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے اودھ کی تاریخ جمع کرنے میں گیارہ بارہ برس تک جو عرق ریزی کی تھی اس میں تحریف کر کے کسی کی خوشنودی حاصل کرنے پر وہ راضی نہیں ہوئے ورنہ تاریخ اودھ ۱۸۶۱ء کے آس پاس ہی شائع ہوگئی ہوتی۔

اٹھارہ برس کے طویل وقفہ کے بارے میں مطبوعہ تاریخ اودھ کی دوسری جلد موسومہ قیصر التواریخ کے صفحہ ۱۶ پر "برگشتگی تقدیر این عاصی پُر معاصی" کے عنوان سے لکھی گئی عبارت میں ہی اس کا ثبوت موجود ہے جس میں کمال الدین حیدر نے اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنی صاف گوئی اور غیر جانب داری کی خطا پر "سرکارین" یعنی بادشاہ اور بادشاہ گر دونوں ہی کی ناراضگی اور عتاب کا شکار ہوگئے۔ مذکورہ بالا عنوان کی پوری عبارت آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔ کمال الدین حیدر یوں رقمطراز ہیں:

"جب اس عاصی پر معاصی نے حسب الحکم ہنری الیٹ صاحب بہادر سکرٹر اعظم گورنمنٹ اور تصحیح و مقابلہ کرنل ولکاکس صاحب بہادر یہ تواریخ اودھ موافق دستور انگریزی لکھی جس میں خوشامد اور تعریف زائد جانبداری کسی کی نہیں مطبوع طبع اکثر صاحبان عالی شان منصف و قدر شناس ہوئی۔ چنانچہ جنرل سلیمن صاحب بہادر ریزیڈنٹ اور کلنٹ صاحب مہتم کالج جنرل مارٹن ڈاکٹر اسپرنجر صاحب نے بہ نظر اصلاح دیکھا اتفاقاً قطب الدولہ مقرب خاص بادشاہ نے اس کا ذکر بادشاہ سے اس خیال سے کیا کہ از راہ قدر شناسی کچھ بھلا ہو جائے مگر خوبی قسمت سے اپنے یہ بالعکس صورت ہوئی ؎

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

صادق آیا۔ یا لقمۂ نان جو بذریعہ صاحب متوفی و بہ سفارش جنرل کانفیلڈ صاحب ریزیڈنٹ بہادر بے منت مومنین دربار مقرر ہوا تھا از راہ قدر شناسی سلطان عادل موقوف ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ قطب الدولہ نے جب تواریخ مجھ سے منگوا بھیجی بادشاہ نے جب حضرت جنت مکان کا احوال دیکھا بہت خوش ہوئے اور تعریف کی، جب اپنے احوال پر آئے بعض مقام جو حقیقت میں سچ تھے دیکھے اور خفا ہو کر برطرف کیا۔ ہر چند میں نے واسطے سے کہا کہ اگر میں خود پڑھ کر اُن مقامات کو سناتا اور خفا ہوتے جواب شافی دیتا مگر مجھے وہ نہ لے گئے۔ یہاں کچھ طمع نہ تھی کہ امیدوار ہوتا، صبر کیا۔ بسر اوقات مع عیال اطفال ۱۸ برس تک توکل پر رہی۔ مگر شکر ہے کہ کسی امیر شہر کے دروازے پر نہ گیا۔ حضور عالم البتہ سال بھر کے بعد کچھ اعانت کرتے تھے۔ موافق اپنے عقیدے کے یہ در دولت کربلا قاسم رزق کا تھا باعزت و بے منت رفع احتیاج ہوئی جب عملداری گورنمنٹ ہوئی متواتر عرض حال کیا۔ کسی نے نہ سُنا، صبر کیا۔ جب عملہ صدر خانہ برطرف ہوا بنگالی وغیرہ جو بسفارش اکبرآباد و الہ آباد سے آئے تھے جنرل سلیمن صاحب سے درخواست پنشن کی کی۔ بادشاہ نے فرمایا پنشن دستور سرکار نہیں اور اس مصنف تواریخ سے ہمیں رنج ہوا ہے۔ بعد اس کے

بخاطر جنرل صاحب تہائی حصہ پنشن کو علے کے لیے اجازت ہوئی سوائے اس معتوب کے بہرحال صبر کرنا چاہیے جب جنرل بیرو صاحب کو چودہ رسالے علمی مع تواریخ اودھ ڈپٹی مرزا عباس بیگ نے دکھائے کہ یہ شخص محروم پنشن سے رہے رپورٹ صدر کو کیا، نصف تنخواہ معینہ یعنی پچاس روپئے ماہواری مقرر ہوئی مگر الحمد للہ کہ وہ کتاب جو ملاحظہ بادشاہ میں آئی تھی ۱۸ یا ۱۹ جز تھے، اب ۷۰ یا ۸۰ جز کے تقریباً کتاب مبسوط طیار ہے۔ ایک جلد فارسی اُردو اور انگریزی جنرل چیمبرلین صاحب نے خود اور باٹر صاحب سے ترجمہ کرایا ہے کئی سے روپیہ اوسکی طبع میں صرف ہوا۔ اور غالب ہے کہ نفع بھی ہو مگر سرکار خود طبع نہیں کر سکتی ہے مجھے اختیار ہے یا جو شخص ازراہ قدردانی طبع کرائے۔ جب اس کے قدرشناس دیکھیں گے البتہ مجھے بہ نیکی یاد کریں گے آئندہ اختیار بخدا۔ وہ کسی کی محنت برباد نہیں کرتا ضرور اس کا اجر دیتا ہے فقط۔"

اب مذکورہ بالا عبارت کے اس جملے پر غور کریں کہ "بسر اوقات مع عیال و اطفال ۱۸ برس تک توکل پر رہی"۔ کیا ۱۸۷۹ء میں چھپی ہوئی تاریخ اودھ میں یہ جملہ اس کی غمازی نہیں کر رہا ہے کہ تاریخ اودھ ۱۸ برس پہلے مکمل کر کے حکام کے سامنے پیش کی گئی تھی قلمی مخطوطہ میں درج ۱۸۶۱ء سے اس کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔

اسی عنوان کے ذیل میں فارسی جلد کا بھی تذکرہ ہے۔ حالاں کہ قلمی دستاویز میں صرف اُردو اور فارسی جلدوں ہی کی موجودگی کا بیان ہے جبکہ مطبوعہ تاریخ اودھ میں ایک تیسری انگریزی جلد کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ بہرحال قلمی مخطوطہ اور مطبوعہ تاریخ میں ذکر کیے گئے فارسی نسخے کے بارے میں سی۔ اے۔ اسٹوری نامی ایک مشہور (CATELOGUER) کیٹلاگر نے اپنی مشہور کتاب پرشین لٹریچر (Persian Literature) مطبوعہ لندن ۱۹۳۹ء) میں لکھا ہے کہ تاریخ اودھ کی فارسی جلد کے بارے میں نہیں معلوم کہ وہ چھپی یا نہیں۔!

لیکن راقم الحروف نے ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر کے۔ پی۔ سریواستو ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ اتر پردیش لکھنؤ کی ناقابل فراموش مہربانی اور الہ آباد اسٹیٹ آرکائیوز کے ٹیکنیکل اسسٹنٹ محترم جلال الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور ذاتی دلچسپی سے مذکورہ تاریخ اودھ کی فارسی جلد کے الہ آباد آرکائیوز میں محفوظ ۹۴ صفحات نہ صرف یہ کہ بچشم خود دیکھے بلکہ چند اہم صفحات کی فوٹو کاپیاں بھی حاصل کر لیں۔ اہم بات یہ ہے کہ فارسی نسخے کی عبارت راقم الحروف کے پاس محفوظ قلمی مخطوطہ سے عین مطابقت رکھتی ہے اس کے برخلاف قلمی مخطوطہ (اُردو) اور مطبوعہ تاریخ اودھ (اُردو) کی زبان اور طرز بیان بالکل مختلف ہیں بلکہ قلمی مخطوطے میں درج واقعات بھی مطبوعہ تاریخ اودھ کے بعض اندراجات کی نفی کرتے ہیں۔

جہاں تک کمال الدین حیدر کے سنہ ولادت و وفات کا تعلق ہے راقم الحروف کے پاس ایک ورق آوارہ پر درج دو قطعات تاریخ کے مطابق ان کی ولادت ۱۷۹۴ء اور وفات ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ مذکورہ قطعات تاریخ کسی شاعر نے جو نجم تخلص فرماتے تھے نظم کیے ہیں بہ ہزار کوشش بسیار ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ نجم کون تھے! اس انکشاف نے کہ سید کمال الدین حیدر کا انتقال ۱۸۸۱ء میں ہوا، مطبوعہ تاریخ اودھ (دسمبر ۱۸۷۹ء) کو اور بھی مشکوک بنا دیا ہے۔ قطعہ تاریخ کے مطابق کمال الدین حیدر نے اٹھتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کمال الدین حیدر نے ۱۸۶۱ء میں حکام کی طرف سے تاریخ اودھ کا اپنا مسودہ واپس لے کر حکام کے حسب مرضی تاریخ میں تحریف پر راضی نہیں ہوئے انگریزی سرکار نے اٹھارہ برس بعد جب کمال الدین قریب المرگ رہے ہوں گے مصنف ہی کے نام سے اپنے ایک ہوا خواہ دگبجے سنگھ آف بلرامپور کے ذریعہ ۱۸۷۹ء میں تحریف شدہ "سوانحات سلاطین اودھ" اور "قیصر التواریخ" شائع کرا دی تاکہ یہ سمجھا جائے کہ کمال الدین حیدر کی نظر میں اگر مطبوعہ تاریخ میں قابل اعتراض مواد ہوتا تو وہ خود احتجاج کرتے۔ دوسری صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ مطبوعہ مذکورہ تاریخ اودھ کمال الدین حیدر کے انتقال کے بعد چھاپی گئی ہو اور کتاب پر سنہ اجرا کمال الدین حیدر کی حیات کا ڈالا گیا ہو تاکہ کوئی اعتراض نہ کر سکے اور ستم بالائے ستم یہ کہ مطبوعہ تاریخ اودھ میں ایک دھمکی آمیز تقریظ لکھ کر اعتراض کرنے والوں کے زبان و قلم پر پہرے بٹھا دیے گئے۔!

تاریخ اودھ پر اب تک لکھنے والوں نے عام طور پر سید کمال الدین حیدر کو انگریزی سرکار کا پرستار گردانا ہے اور بعضوں نے تو مرحوم کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے حالانکہ اگر نگاہ انصاف سے دیکھا جائے اور مطبوعہ تاریخ اودھ ہی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اسی میں انگریزوں کی مکاری ثابت کرنے کا بہت کچھ مواد موجود ہے اور قلمی مخطوطہ کے مندرجات و مصدقات کی روشنی میں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ سید کمال الدین حیدر انگریزی حکومت کے خیر خواہ تھے۔

لیکن حالات کی اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ ایک جابر اور ظالم حکومت نے اپنی طاقت کے زور پر ہندستان کے وطن پرستوں کو غدار اور بعض غداروں کو "ہیرو" بنا کر سیدھے سادے ہندستانیوں کو گمراہ کرنے کا عمل برسوں جاری رکھا۔[۳]

عہد حاضر کا تقاضہ ہے کہ ذاتی مفادات اور جھوٹی انا کی تسکین کے لئے تاریخ کے چہرے پر گمراہ کن پردے ڈالنے والوں کے برخلاف صاحبان انصاف تاریخ اور مورخین کے چہروں پر پڑی ہوئی نقابوں کو ہٹا کر عوام کو حقیقی صورت حال سے روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیں۔ خصوصاً اودھ کے ایک ایسے مورخ کے بارے میں تحقیق کا حق ادا کریں، جو ۱۷۹۴ء میں (سید کمال الدین حیدر) پیدا ہوا تھا اور جو نواب سعادت علی خاں، اودھ کے پہلے بادشاہ غازی الدین حیدر، دوسرے بادشاہ نصیر الدین حیدر، تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ، چوتھے بادشاہ امجد علی شاہ پانچویں بادشاہ واجد علی شاہ و برجیس قدر کی سلطنتوں کے احوال اور غدر (جنگ آزادی) کے حالات نیز اودھ پر انگریزی سرکار کے غاصبانہ قبضہ کا ایک چشم دید گواہ بھی تھا۔

□□

حواشی:

۱۔ "سوانحات سلاطین اودھ" مطبوعہ جلد اول ص۲۰۱

۲۔ قیصر التواریخ

۳۔ بیگم حضرت محل اور تحریک آزادی۔ مطبوعہ ماہنامہ شیرازہ جلد ۲۱ شمارہ ۸، اگست ۱۹۸۲ء سرینگر کشمیر (مضمون راقم الحروف)

۴۔ قلمی مخطوطہ سید کمال الدین حیدر جلد دوم موسومہ "تقویم حال سلطنت صوبہ اودھ"

۵۔ قلمی مخطوطہ جلد اول (سید کمال الدین حیدر)

۶۔ قلمی مخطوطہ جلد دوم (" " ")

۷۔ "حضرت مکان" طباعت کی غلطی ہے دراصل "جنت مکان" ہونا چاہئے کہ یہ امجد علی شاہ کا لقب تھا۔ یہاں پر غالباً انھیں کی طرف اشارہ ہے غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد "خلد مکان" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ (ر۔ا)

سلام
اصحاب اہلِ بیتؑ

شاعر: ---

سلام تم پہ اے اصحابِ اہلِ بیتؑ سلام
تمہاری عالی مقامی میں کچھ نہیں ہے کلام

آواز: جہاد تیری امانت ہوں سرخرو ہوں میں
سنو، سنو کہ خطابت کی آبرو ہوں میں
چلا ہوں لیکے صداقت کی عظمتِ روشن
بڑھا رہا ہوں شجاعت کی عظمتِ روشن

شاعر: سلام تم پہ اے اصحابِ اہلِ بیتؑ سلام
تمہاری عالی مقامی میں کچھ نہیں ہے کلام

آواز: فتح مبین کی عظمت کا ایک منظر ہوں
اگر فرات ہے دریا تو میں سمندر ہوں
جو کٹ گئے ہیں یہ بازو تو ہم کو کیا غم ہے
ہمارے نام پہ دنیا کی آنکھ پُرنم ہے

شاعر: سلام تم پہ اے اصحابِ اہلِ بیت سلام
تمہاری عالی مقامی میں کچھ نہیں ہے کلام

افتخار عباس افضل
۱۸۹/۲۲۵ [illegible] ۲۲۶۰۰۳

امیر حسن نورانی
نظر باغ ۔ لکھنؤ

لکھنؤ میں فنِ طباعت کا آغاز و ارتقا

ایک مختصر جائزہ

سر زمینِ لکھنؤ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ کئی صدیوں سے علم و دانش کا مرکز رہا ہے ۔ ہر دور میں ہنر مندوں اور فن کاروں کی بدولت اس کو نمایاں حیثیت رہی ہے ۔ جہاں تک فنِ طباعت کا تعلق ہے اس کا آغاز یہاں کچھ تاخیر سے ہوا لیکن مختصر مدت میں اس فن کو اتنا دلکش و دیدہ زیب بنا دیا کہ اسے دوسرے ہم عصر مطابع پر فوقیت حاصل ہو گئی اور نصف صدی کے اندر لکھنؤ کے مطابع کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی ۔ مرزا غالب نے لکھنؤ کی طباعت اور مطابع کے متعلق لکھا ہے :

دیوانِ اُردو چھپ چکا ، ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا ۔ حُسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا ۔ دلّی اور اس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت ۔ صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرتا ، جیسے کوئی کتے کو آواز دے "۔[۱]

ہندستان میں فن طباعت کا آغاز ۱۵۵۵ء میں پرتگالیوں کی بدولت ہوا ، جنھوں نے جنوبی ہندستان میں پہلا مطبع قائم کیا ۔ اس کے بعد سری رامپور کے عیسائی مبلغوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جنوب میں کئی مقامات پر مطابع جاری کیے اور اس علاقے کی زبانوں میں کتابیں طبع کیں اور اس فن کو ترقی دی ۔ ۱۷۷۲ء میں مدراس کے اندر بھی چھاپہ خانہ قائم ہو چکا تھا ۔ کلکتہ میں ۱۷۷۹ء میں مطبع قائم ہوا ۔ ۱۸۰۱ء میں "ہندستانی پریس" کے نام سے کلکتہ میں ایک مطبع قائم ہوا ، جس میں فارسی اور اُردو کی کتابیں چھپنے لگیں ۔

لکھنؤ میں پہلا مطبع نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ۱۸۲۰ء میں اپنی تخت نشینی کے بعد قائم کیا تھا ۔ یہ مطبع ایک انگریز مسٹر رسل کے ذریعہ جاری کرایا گیا تھا ، جس کا سامان وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ لکھنؤ میں تیار کیا تھا ۔ یہ ٹائپ پریس تھا ، اس کا نام سلطان المطابع رکھا گیا ۔ اس مطبع نے عربی اور فارسی کی بڑی ضخیم کتابیں طبع کیں جن میں فارسی لغت ، ہفت قلزم کی سات جلدیں اور تاج اللغات عربی کی آٹھ سے زیادہ جلدیں شامل ہیں ۔ حسنِ طباعت اور صحت کے اعتبار سے ان کو بہت پسند کیا گیا ۔ اس مطبع میں کتابوں کے علاوہ شاہی فرمان اور دوسرے دفتری کاغذات بھی چھپتے تھے ۔ سلطان المطابع کے بعد لکھنؤ میں لیتھو طریق طباعت کا سلسلہ شروع ہوا اور متعدد مطابع کا قیام عمل میں آیا ، جن میں کتابوں کے علاوہ اخبارات بھی طبع ہوتے تھے ۔ یہاں صرف ان چند مطابع کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اپنے طباعتی کارناموں کے باعث بہت مشہور و ممتاز ہیں ۔

مطبع حاجی حرمین شریفین

سلطان المطابع کے بعد اس مطبع کا قیام عمل میں آیا ۔ اس کے مالک حاجی محمد حسین تھے جو لکھنؤ کے ایک معزز شہری تھے اس کا نام مطبع محمدی رکھا تھا لیکن یہ مطبع حرمین شریفین کے نام سے مشہور ہوا ۔ حسن طباعت کے اعتبار سے اس کا معیار بہت بلند تھا ۔ اس مطبع نے مذہبی کتابوں کی طباعت پر زیادہ توجہ دی ۔ ۱۸۴۹ء میں بادشاہ اودھ کے حکم سے تمام چھاپے خانے بند کر دیے گئے اور اعلان کیا گیا کہ "اگر کوئی شاہی اجازت کے بغیر ظاہری یا باطنی طور پر کچھ چھاپے گا تو مجرم لکھا جائے گا "۔[۲]

اس اعلان کے بعد تمام مطابع بند ہو گئے ۔ یہ مطبع بھی بند ہو گیا اس پابندی پر شاق ہو کر حاجی حرمین اپنے مطبع کو کان پور لے گئے لیکن وہاں

زیادہ کامیاب نہ ہوسکا۔ کچھ عرصہ بعد حکومت کی طرف سے سلطان المطابع کے داروغہ کی حیثیت سے شیخ مہذب علی مقرر کیے گئے، انھوں نے تمام مطابع کے مالکان کو طلب کیا اور حکم دیا کہ "سب کے سب اپنا اپنا مطبع، سلطان المطابع کے احاطے میں لے آئیں۔ بصورت دیگر مچلکا دیں کہ تمام عمر اس شہر میں پھر کبھی کچھ نہ چھاپیں گے"۔ چونکہ حاجی حرمین کا مطبع کان پور میں فائدہ بخش نہیں تھا اس لیے وہ دوبارہ لکھنؤ لے آئے اور سرکاری حکم کے مطابق سلطان المطابع کے ماتحت کام کرنے لگے۔ ہر مطبوعہ کتاب پر سرکاری مطبع کی مہر لگنا ضروری تھا۔ حاجی حرمین کا یہ مطبع اپنی خوش نما طباعت اور صحت و کتابت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا۔ اخبار طلسم لکھنؤ اسی مطبع میں طبع ہوتا تھا جو لکھنؤ کا پہلا اردو اخبار تھا۔

مطبع مصطفائیؒ

یہ مطبع حاجی حرمین کے مطبع محمدی کے بعد قائم ہوا۔ اس کے قیام کا باعث ایک اہم واقعہ تھا۔ لکھنؤ کے مشہور دولت مند تاجر مصطفےٰ خان کچھ چھپوانے کے لئے حاجی صاحب کے پاس گئے۔ دوران گفتگو کسی بات کا جواب حاجی صاحب نے ترش روئی سے دیا۔ مصطفےٰ خاں کو ان کی بات ناگوار گزری اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔ انھوں نے اپنا مطبع قائم کرنے کا انتظام کیا۔ اس کے متعلق مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے:

"انھیں دنوں مصطفےٰ خاں شیشہ آلات کے ایک دولت مند تاجر کچھ چھپوانے کے لئے حاجی حرمین کے پاس لے گئے اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا سخت کلمہ نکل گیا کہ مصطفےٰ خاں نے گھر آکر خود اپنا مطبع مصطفائی جاری کیا"۔[۳]

مطبع مصطفائی حسن طباعت کے اعتبار سے اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ مولانا شرر نے اس کو سب سے اچھا مطبع قرار دیا ہے۔ اس مطبع نے عربی فارسی کتابوں کے علاوہ اردو کی بہت سی مستند و معیاری کتابیں طبع کیں۔ جب شاہی حکم سے تمام مطابع بند کر دیئے گئے تو یہ بھی بند ہوگیا جس کی وجہ سے مالک مطبع بہت پریشان ہوئے اور وہ بھی اپنا مطبع کانپور لے گئے۔ ان کو بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو حاجی حرمین کو در پیش ہوئی تھیں۔ حکومت کے دوسرے اعلان کے بعد یہ مطبع لکھنؤ لایا گیا اور سلطان المطابع کے زیر نگرانی کام کرنے لگا۔ اس کی مطبوعات پر بھی سلطان المطابع کی مہر ہوتی تھی۔

مطبع علوی

یہ مطبع علی بخش خاں نے مطبع مصطفائی کے بعد قائم کیا تھا۔ اچھی طباعت کے باعث یہ بھی لکھنؤ کے چند معیاری مطابع میں شمار کیا جاتا ہے شاہی دور کے مذکورہ مطابع نے فارسی اور عربی درسیات اور دوسری مذہبی کتابیں اتنی خوبصورت اور دیدہ زیب چھاپیں جن کا مقابلہ ہندستان کے دوسرے مطابع نہ کر سکے۔ یہ کتابیں حسن طباعت اور صحت کے لحاظ سے موجودہ دور کی تمام کتابوں کو آئینہ دکھاتی ہیں جو آفسیٹ اور بلاک کے ذریعہ طبع ہوتی ہیں۔ شاہی دور میں ۱۸۵۷ء سے پہلے جاری ہونے والے مطابع کی تعداد بہت ہے جن کی تفصیل مشہور کتاب "اختر شہنشاہی" سے معلوم ہوتی ہے۔ ان میں حسب ذیل مطابع نے اپنی بعض خوبیوں کے باعث بہت شہرت حاصل کی۔

مطبع مرتضوی

یہ مطبع ایک ماہر ہنرمند شیخ نثار علی نے قائم کیا تھا۔ یہ بھی سلطان المطابع سے منسلک تھا اور اسی کی ماتحتی میں کام کرتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بند ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۸ء میں جب مطبع نول کشور قائم ہوا تو منشی نول کشور نے نثار علی کو داروغہ طباعت مقرر کیا اور اودھ اخبار شمارہ جنوری ۱۸۶۲ء میں اپنے ایک مضمون میں نثار علی کی فنی مہارت کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کے علاوہ جن مطابع نے کتابوں کی طباعت و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان میں مطبع جلالی (۱۸۴۰ء) مطبع میر حسن رضوی (۱۸۴۲ء) مطبع مولائی (۱۸۴۵ء) مطبع احمدی (۱۸۴۷ء) مطبع مہدیہ (۱۸۴۹ء) مطبع ولی محمد، مطبع ثمر ہند، مطبع جعفری، مطبع حسینی کے نام مشہور ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے قبل قائم ہونے والے متعدد اور بھی مطابع تھے

مطبع منشی نول کشور

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد علم و ہنر کا یہ شاداب گلستاں نذر خزاں ہوگیا۔ اس کا امن و امان غارت ہوا تو ہر شعبۂ زندگی پر اس کا اثر پڑا۔ شاہی دور کے اکثر مطابع بند ہوگئے۔ کچھ لوٹ مار میں تباہ و برباد ہوگئے۔ ان کو چلانے والے ہنرمند اور فن کار بے روزگار ہو کر نان شبینہ کے

محتاج ہو گئے۔ اور قسمت آزمائی کے لئے دوسرے مقامات کا رخ کرنے لگے۔

ان حالات میں منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں انگریزی حکومت کا تعاون حاصل کر کے اپنا مطبع قائم کیا اور اودھ اخبار جاری کیا۔ نولکشور نے نہایت محنت اور لگن سے کام کیا جسکی بدولت اس مطبع نے مختصر مدت میں حیرت انگیز ترقی کی۔ طباعت کے فن میں جدتیں اور اکثر ان ماہرین فن کی خدمات حاصل کرلیں جو شاہی دور کے مطابع میں کام کرتے تھے کئی مطابع کے مالک جو بے روزگار ہو گئے تھے اس مطبع سے وابستہ ہو گئے۔ ابتدا میں سارا کام دستی پریسوں سے ہوتا تھا جو منشی نول کشور نے خود تیار کرائے تھے۔ یہاں تک کہ ان پریسوں کی تعداد تین سو تک ہو گئی۔ ۱۸۸۴ء میں ایک امریکن سیاح نے مطبع کا معائنہ کرنے کے بعد ایک مضمون لکھا جس کے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

..... اس مطبع (نول کشور) کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ یورپ میں اس کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر سے کم نہ ہوگی۔ کشور ایسا ہونہار اور چالاک ہے کہ ولایت سے ٹائپ نہیں منگواتا ہے بلکہ خود حروف ڈھالنے کا کرتب سیکھ لیا ہے..... ایک کمرے کے پریسوں کو میں نے شمار کیا اس میں اکسٹھ تھے جو ہاتھوں سے چلائے جاتے تھے...

..... نول کشور پریس کا گودام عجائبات عالم سے ہے اس میں غیر مجلد کتابیں زمین سے چھت تک قطاروں میں لگی ہیں۔ اس مطبع میں کام کرنے والے جو لوگ ہیں ان کی تعداد بارہ سو سے کم نہ ہوگی۔" [۲۶]

مطبع نول کشور میں اردو، فارسی، عربی اور بعض ہندی کتابوں کی طباعت دستی پریسوں پر پتھروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ منشی نول کشور کی زندگی تک مطبوعات کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ان میں ضخیم اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل کتابوں کی تعداد بہت ہے۔

جب نول کشور نے اپنے مطبع کے لئے ولایت سے طباعت کی مشینیں منگوالیں تو اکثر دستی پریسوں کو ان کے چلانے والوں کے حوالے کر دیا کہ وہ ان کو اپنے مکانوں پر یا کسی اور مناسب جگہ پر لگائیں اور طباعت کے لیے ان کو مطبع سے کام دیا جائے گا۔ اس طرح لکھنؤ کے اندر مطابع کی تعداد بڑھ گئی۔ جو پریس مین دستی پریس اپنے گھر پر لگاتا وہ ایک نام بھی رکھ لیتا تھا۔ ان میں بعض نے ترقی کر کے طباعت میں خاص مقام حاصل کر لیا۔ لکھنؤ کی چھپی ہوئی کتابوں پر اکثر مطابع کے نام نظر آتے ہیں۔

مطبع نامی

نول کشور پریس کے بعد کئی مطابع نے شہرت حاصل کی۔ ان میں مطبع نامی کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کے بانی خواجہ قطب الدین تھے جنھوں نے عرصہ تک مطبع نول کشور میں کام کیا تھا، اس کے بعد اپنا مطبع قائم کیا اور ہر علم و فن کی سیکڑوں کتابیں طبع کیں۔ اس کا شمار لکھنؤ کے معیاری مطابع میں ہوتا تھا اور آج تک طباعت کے میدان میں گامزن ہے۔

اصح المطابع

یہ مطبع بھی لکھنؤ کے مشہور مطابع میں شمار کیا جاتا ہے اس کو مولانا عبدالعلی عاصی نے قائم کیا تھا۔ محلہ محمود نگر میں واقع تھا۔ اس مطبع نے عربی زبان کی مستند مذہبی کتابیں شائع کیں۔ اردو میں بھی اس کی مطبوعات کی تعداد بہت ہے۔ یہ مطبع اپنے بانی کے بعد زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔

مطبع نظامی

لکھنؤ کا یہ مطبع بہت مشہور ہے۔ اس کے مالک مشہور خوشنویس منشی محمد جواد تھے جنھیں خطِ نسخ لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ اس مطبع نے بھی حسنِ طباعت، صحت و صفائی کا اچھا معیار قائم کیا۔ خط نسخ میں لکھی ہوئی عربی کتابوں کی طباعت جیسی دلکش اور دیدہ زیب اس مطبع میں ہوئی وہ لکھنؤ کے کئی دوسرے مطابع میں کم نظر آئی۔ منشی محمد جواد کے بعد ان کے جانشینوں نے جو اچھے خوشنویس تھے کسی نہ کسی طرح اس مطبع کو جاری رکھا۔ یہ اب بھی اردو طباعت کا اچھا معیار قائم کیے ہوئے ہے۔

دیگر مطابع

لکھنؤ میں لیتھو طریق طباعت کے مطابع کی تعداد ہر دور میں بہت رہی ہے لیکن اس زمانے میں بلاک اور آفسیٹ کی طباعت کا رواج بڑھ گیا، اور لیتھو طباعت کی طرف توجہ کم ہو گئی۔ تاہم لکھنؤ میں اب بھی متعدد مطابع موجود ہیں لیکن ان میں کوئی بھی گزشتہ مطابع کی خصوصیات کا حامل نظر نہیں آتا۔

لکھنؤ کے مطابع کی کامیابی اور مقبولیت میں فن خوش نویسی کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ماہر فن خطاطوں اور خوش نویسوں کی تعداد عہد شاہی میں

مُظفّر علی
کوٹ وارہ ہاؤس ۔ قیصر باغ
لکھنؤ

واجد علی شاہ کا لکھنؤ

گلشن عجب بہار کہ ہر قصر رشکِ خلد
اور گومتی غضب کی ہے دریائے لکھنؤ
حور و پری کو رشک تھا اک ایک شخص پر
بے مثل تھے سبھی مہِ سیمائے لکھنؤ

——— واجد علی شاہ

شہر کو خیرباد کہتے ہی گومتی نے اپنے بہاؤ کا رُخ بدل دیا ہے ...... ایک شوریدہ دریا..... مٹی کے ٹیلے کو اندر ہی اندر کاٹتا ہوا ٹیڑھا بیڑھا گھومتا گھماتا ضلع سے گزرتا ہے ۔ تھکا ہارا اور فرقت زدہ ...... یادوں سے پرے ، گمنام سا ــــ یہ دریا اپنی موجودگی کا احساس صرف المناک سیلاب سے کراتا ہے ...... لا مارٹینیر اس کا شاہد ہے جہاں سیلاب کے لیول پتھر کے زینوں پر لگی پتھر کی پٹیوں پر نقش ہیں ۔

اب اس کے تلاطم کو پشتوں اور بیریروں سے روک دیا گیا ہے اور یہ پھر بھی روانی سے لیکن آلودگی سے بھرپور بہہ رہا ہے ۔

اس کی خوبصورتی اور عظمت کے دن بیت گئے ہیں ..... دن اس کے محبوب کے ، جب بسنت کے موسم میں زرد لباسوں میں ملبوس خواتین ، بجروں میں سوار اس کے پانی سے اٹھکیلیاں کرتی تھیں ..... بھگوان کرشن اور رادھا کے دریا کے کنارے یکجا ہو جانے کے دن ۔

خوابوں کا شہر لکھنؤ ــ تبدیلی کی ہواؤں سے غافل تھا..... دریا تجارتی بنتا جا رہا تھا اور اس حقیقت کے پس منظر سے ایک نئی دنیا اُبھر کر سامنے آ رہی تھی ...... پھر بھی دل سے یہ شہر شاعرانہ اور مثلِ خواب بنا رہا..... یاد کرتا رہا وہ جسے وہ بُھلانا نہیں چاہتا تھا .... بُھلاتا رہا وہ جسے وہ یاد رکھنا نہیں چاہتا تھا...

.... وہ حساس اور جراحت پذیر بنا رہا ۔ یہ واجد علی شاہ کا شہر تھا ــــ ایک شاعر ، جس کے لئے اس کا شہر اور اس کے لوگ فیضان حاصل کرنے کا ذریعہ تھے ۔ اس کا آرٹ اور اس کی تہذیب ۔ اپنی نو سالہ خوبصورت سی حکومت کے دوران اس نے شہر کو ایک ایسی زندگی دی تھی جو اس کی پہچان بن گئی تھی ۔ حالاں کہ آج جو کچھ بچا ہے وہ اس کے بنیادی کردار کا ذرّہ برابر ہی بچا ہے ۔

واجد علی شاہ کو سمجھنے کے لیے تاریخ کی ان طاقتور گتھیوں کو سلجھانا پڑے گا جس کی وجہ سے وسطی ہندستان میں مغلوں کا ، پنجاب میں سکھوں کا ، دکن میں مرہٹوں کا ، بنگال میں نواب نظاموں کا زوال ہوا ۔ واجد علی شاہ کو سمجھنا تصویر کے دوسرے رُخ کو سمجھنا ہے ..... ہندستانی تاریخ کے منطقی مناظرے جس سے شروع ہوئی آزادی کی پہلی جنگ .... جدوجہد اور اس کے نتائج ۔

۱۸۵۷ء کی غدر ہندستانی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر آزادی کی پہلی جنگ بن جاتی ہے ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندستانی حکمرانوں نے اسے تاریخ سے باہر ڈھکیل دیا ، اور جب آزادی کے لئے نئے سرے سے جدوجہد شروع ہوئی تو ہمارے رہنما اس کی مناسبت واضح نہ کر سکے ۔ جب ہم صنعتی تمدن کے نو آبادیاتی معاشرے اور پھر مغربی تہذیب کے اثرات سے آزاد ہندستان بن کر اُبھرے تب کئی ایسے لوگ جو پس منظر میں تھے وہ ایک سالم اور زوال پذیر معاشرے کے لیے موزوں ہونے لگے ۔ کلچر کو جوڑنے والا کردار کافی اہم ہو گیا ۔ ان لوگوں میں واجد علی شاہ کسی طرح سے سب سے زیادہ کریم النفس اور دلکش نظر آتے ہیں ۔ ان کی شخصیت اپنے آپ کو کئی رنگوں میں پیش کرتی ہے ۔ ان کے ماحول کا حصار ، اپنی رعایا میں ان کی دلچسپی ،

انصاف پسندی، بہادری اور بانکپن، بھگوان کرشن کا دلکش انداز ۔۔ انھوں نے کثرت سے اسی طرح کے شواہد چھوڑے ہیں جو اُن کی انھیں خوبیوں کی مثال ہیں۔

واجد علی شاہ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو جب وہ ۲۴ سال کے تھے تخت نشین ہوئے۔ خصوصی طور پر بادشاہ ہونے کی شان و شوکت میں دلکشی تھی اور اس سے متعلق دھوم دھام سے وہ نہایت لطف اندوز ہوتے تھے ان کی دریا دلی سے کوئی محروم نہ تھا اور ہر خاص و عام پر ان کا دست شفقت تھا۔ امجد علی شاہ کی پیوریٹن پرست حکومت کے بعد ان کے جانشین کے آتے ہی اودھ میں تبدیلی کی لہریں چل پڑیں۔ نوجوان بادشاہ اپنے فرائض کو انجام دینے میں پورے جوش و خروش سے لگ گئے اور نظم و نسق کے ہر پہلو پر پورا دھیان دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ انھوں نے ایک گہرا رشتہ قائم کیا۔

پوری طرح سے حُسن و جمال پرست۔ انھوں نے جو بھی کیا اس میں گہری دلچسپی لی۔ انھوں نے اپنی پریڈ کے لیے کئی پلیٹ فارم بنائے جن میں ہر ایک پر ایک خاص اسٹائل کی چھتری ہوتی تھی۔ بادشاہ اپنے آپ کو فوج کا ایک اعلیٰ افسر سمجھتا تھا اور اپنی حکومت کے آغاز کا ایک بڑا حصّہ اس نے فوجی معاملات پر صرف کیا۔ اپنے فطری شاعرانہ مزاج کی بدولت انھوں نے اپنی پیدل اور رسالدار فوجی ٹکڑیوں کے بانکا، ترچھا، اختری، سلطان غازی، منصوری، غضنفری، حُسینی، حیدری، شاہدی اور دکھنی جیسے اثر انداز نام رکھے۔ ان کی فوجی ٹکڑیوں کے ایک حصے میں تیلگو سپاہی تھے، جنھیں وہ گھنگھور، خاص دل، جان نثار، فتح مبارک، گلاب، سلیمانی، ظفر وغیرہ ناموں سے پکارتے تھے۔ ہدایات بھی فارسی زبان میں تھیں۔ خواتین کی بھی فوجی ٹکڑیوں کی تشکیل کی گئی، اور انھیں فوجی قواعد اور پریڈ کرنے کی ٹریننگ دی گئی۔ خاص کر جنتی گوریلا لڑاکو خواتین کی بٹالین قابل ذکر تھی۔ آفتاب طلوع ہوتے ہی پریڈ شروع ہو جاتی تھی اور شہر کے لوگ بڑے شوق سے اس انوکھے فوجی مظاہرے سے لطف اندوز ہونے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔

ان کی پریڈوں کی شان و شوکت تصوّرات میں افسانوی حیثیت کی حامل ہے۔

ندی کے پار اذان کی آواز گونج رہی ہے۔ بادشاہ مسجد آصفی میں عبادت کرتے نظر آتے ہیں...... باہر سو گھوڑسوار منتظر ہیں۔ بادشاہ کا سیاہ گھوڑا چاندی کے زیورات اور اودھ کے فوجی دربار کے دوشیزۂ آب کے نشان کی نمائش کرتے ہوئے کشیدہ کاری والے گھوڑوں کے ساز سے لیس ہے۔

دریا پر کئی چھوٹی چھوٹی ناویں (کشتیاں) مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال پھینکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بادشاہ خوش نما وردی میں ملبوس اپنے سپاہیوں کے ساتھ دریا کے کنارے کی طرف شان سے قدم بڑھاتے ہیں۔

بادشاہ سے پہلے پہونچنے والے گھوڑ سوار ترکی سپاہیوں نے چاندی کا ایک بڑا صندوق میدان میں رکھا ہے۔ ہدایتوں کی آوازیں سبز گھوڑوں کی ٹاپ سنتے ہی مصیبت زدہ لوگ اپنی اپنی فریاد صندوق میں ڈالنے کے لیے بڑھتے ہیں .... وہ پسینے سے شرابور محل واپس آتے ہیں اور ساتھ میں شکایتی بکس جس کی کنجی صرف انھیں کے پاس ہے۔ اس کے بعد بادشاہ ہر فریاد کو خود پڑھتا ہے۔ اس طرح سوشل جسٹس کے ایک رومانی انداز کے ساتھ اس کے دن کی شروعات ہوتی ہے۔

اپنی رعایا کے ساتھ اس کے گہرے رشتے سے اودھ کے حکمرانوں اور برطانوی حکومت کے مقامی حکمرانوں کے بیچ جو مبہم سا دستور العمل تھا اس کی خلاف ورزی ہوئی۔ انگریزوں کو اس وقت کئی استحقاق اور مراعات حاصل تھیں، جب نواب سعادت علی خاں نے ۱۸۰۱ء میں صلح نامہ پر دستخط کیے۔ نتیجتاً اسے کمپنی کی فوجوں کے قیام کے لئے روہیل کھنڈ، دوآب اور گورکھپور چھوڑنا پڑا۔ نوآبادکاروں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی طاقت میں اور بھی اضافہ کر لیا اور حقیقتاً حکومت وہی چلانے لگے۔

جیسے جیسے واجد علی شاہ کی شہرت بڑھی ویسے ویسے رعایا میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی وجہ سے حکومت برطانیہ کے لئے ان کا وجود خطرہ بن گیا۔ پھر انگریزوں نے ان کی شہرت کو داغدار کرنے کے لئے کہانیاں گڑھنا شروع کر دیں جو ان کی تاریخ کی تمہید بن گئیں۔

غیر معمولی طور پر قابل اور لائق بادشاہ نے شاعری، موسیقی اور رقص

کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اظہار کیا۔ اس کا تخلص اختر تھا اور وہ اکثر عام محفلوں میں نثر اور نظم کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ تقریباً ایک سَو سے زیادہ شائع شدہ کتابیں اس سے منسوب ہیں۔ اس کی شاعرانہ مہارت "مثنوی بحر مختلف" میں دیکھنے کو ملتی ہے جو الگ الگ بحروں میں لکھی گئی ہے ـــ اپنے "عشق نامہ" میں اس نے اپنے عشقیہ نازو انداز کے ۱۳۲ واقعات، جو کہ اس کی آٹھ سال کی کمسنی کی عمر سے ہی شروع ہو گئے تھے، کا تذکرہ کیا ہے۔

واجد علی شاہ جنیاتی ترغیب پر لکھے گئے اپنے مضامین میں بہت زیادہ کھلے ہوئے اور صاف گو تھے۔ اور اس طرح انھوں نے اپنی نجی زندگی میں بھی اپنے لوگوں کو شامل کر لیا تھا۔ انھوں نے ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا اور اپنی کرشماتی شخصیت سے انھیں سحر زدہ کر دیا تھا۔

بادشاہ، کرشن اور ان کی گوپیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا منظر پیش کرنے والی راس لیلا سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس تھیم نے اسے اتنا زیادہ متاثر کیا کہ اس نے اس پر کئی رقص تیار کئے اور ان کے ضابطے ترتیب دیئے۔ عطر منزل گھنگھروؤں کی کھنک سے گونجتی رہتی تھی۔ مور کے پروں میں ملبوس بادشاہ خود کرشن کنہیا کا کردار ادا کرتا تھا۔ اس کے اس جوش و خروش سے جلد ہی بیگمات اور گرد و پیش کے لوگ بھی متاثر ہونے لگے اور وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ رقاص قلندر بخش اور حیدر علی انھیں کرشن کی گوپیوں کی طرح رقص کرنے کی ٹریننگ پری خانہ میں دیتے تھے۔ اسے رہس کہتے تھے۔ وہ ساتھ ہی ساتھ پلاٹ کی بھی تشکیل کرتا جاتا تھا اور اپنے رقاصوں سے سولو کراتا تھا اور اس رقص میں پھیر بدل کر انھیں اور بھی دلچسپ بناتا تھا۔ کسی بھی رقص کی ترتیب میں وہ گہری دلچسپی لیتا تھا، جو کہ سینریوں، کرداروں کا ایکسپوزیشن اور پلاٹ پر اس کے نوٹس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان رہس کے ذریعہ کتھک رقص اپنے حقیقی روحانی مقام پر پہونچا، اس وقت کے کسی اور حکمراں نے ایسا نہیں کیا۔ اسی کی حکومت میں کتھک کو فروغ ملا۔ کتھک کے مشہور و معروف ماہر درگا پرشاد نے واجد علی شاہ کے لئے لکھا ہے:

" ہر کام کو خوش اسلوبی اور دلکش انداز میں انجام دینے والے واجد علی شاہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے موسیقی اور رقص میں ٹھمری کی شروعات کی۔"

اس کی ٹھمریاں اختر پیا کے تخلص سے لکھی گئی ہیں "غنچۂ راگ" اور "صوت المبارک" اس کے میوزیکل شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

اس کے یہ مظاہرے اتنے زیادہ اثر انداز ہوئے کہ وہ جلد ہی عام لوگوں میں مقبول ہو گئے اور میاں امانت کو 'اندر سبھا' لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اس کے مکالمے نظم میں تھے ...... شروع پردہ ہٹتے ہی اندر (واجد علی شاہ راجہ اندر کے کردار میں) اپنے جاہ و جلال میں نظر آتے ہیں۔ 'آمد' کی اداکاری پر بجنے والے طبلے کی تھاپ پر خاموش بیٹھے۔ پھر کوہ قاف کی پریاں یکایک نمودار ہوتی ہیں اور سامعین کو غزل کی دھن پر اپنے سولو رقص سے چکا چوند کر دیتی ہیں۔ شاندار گت کے ساتھ وہ اندر کے ساتھ گوشہ نشین ہو جاتی ہیں ...... حالاں کہ یہ سب ہندستانی روایت میں ڈھلے ہوئے تھے لیکن ان میں فارسی تصورات کے بھی دیدار ہوتے تھے۔ اندر سبھا کی مقبولیت سے عشقیہ کہانیوں کی دلچسپ نقلوں میں پھر سے جان پڑ گئی۔

رقص میں بادشاہ کی مہارت اس کی کتابوں "بنی" اور "ناجو" میں ظاہر ہوتی ہے جس میں اس نے کتھک کی تکنیک کا بیان تصویروں کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے نئے نئے تجربوں سے کتھک رقاصوں کو 'سنچاری بھاؤنا' اور 'بھاؤ بھاؤنا' میں مظاہرہ کرنے کا ایک بڑا کینوس ملا۔ اس سے کتھک رقص کی خوبصورتی اور زیادہ نکھر آئی اور یہ آرٹ کا درجہ حاصل کر سکا۔

کرشن لیلا اور اندر سبھا کے درباری مظاہروں کو جن میں واجد علی شاہ مرکزی کردار ادا کرتے تھے، ان کے وقت میں اور زیادہ رنگا رنگ بنایا گیا۔ فائن آرٹس میں ان کی گہری دلچسپی کی وجہ سے ہولی، دیوالی بسنت اور دسہرہ جیسے تہواروں کو خوشنمائی کی بلندیوں تک پہنچایا گیا وہ سبھی مذاہب کے لوگوں میں یکساں مقبول تھے۔

محرم بھی اسی ڈرامائی انداز میں کئی دنوں تک منایا جاتا تھا اور اس میں نظم اور ووکل ایکسپریشن کو کئی جمالیاتی رنگوں سے رنگا گیا۔

ہر تیج تہوار کو آرٹ اور کرافٹ سے جڑی انسانی تصورات کی بلندیوں تک پہونچایا گیا۔

میجر جنرل سلیمن ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۴ء تک لکھنؤ میں برطانی ریزیڈنٹ تھا۔ چوں کہ اس کا نظریہ بہت زیادہ متصوفانہ تھا اس لیے اودھ دربار کے بارے میں اس کے خیالات نہایت نفرت انگیز تھے۔ ساورین اور منسٹریس پر دی گئی اس کی ایک رپورٹ میں سلیمن نے واجد علی شاہ کو بیہودہ قسم کی تفریحات کا عادی بتایا اور لکھا کہ وہ پوری طرح خواجہ سراؤں اور ناچنے گانے والوں کے ہاتھوں میں تھا۔ پھر بھی وہ ۱۸۰۱ء کے معاہدے کو ختم کرنے کی مناسب وجہ نہ پا سکا۔ جیسا کہ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

۱۱ر اکتوبر ۱۸۴۹ء: "اس نے کبھی بھی ظلم نہیں کیا ہے اور نہ ہی کوئی بدتمیزی کی۔"

۱۲ر جون ۱۸۵۳ء: "وہ نہ ظالم ہے اور نہ ہی بے رحم۔"

یکم جون ۱۸۵۴ء: "اس جیسا دریا دل انسان، جیسا کہ مجھے یقین ہے پہلے کبھی بھی تخت نشین نہیں ہوا۔"

جیمس انڈریو رئیسے، ارل آف ڈلہوزی ۳۵ سال کی عمر سے گورنر جنرل بنا۔ ڈلہوزی اور واجد علی شاہ دونوں ہی ایک ساتھ ۱۸۴۸ء میں اقتدار میں آئے۔ وہ دونوں ہی اپنے والدین کی دوسری اولاد تھے۔ دونوں ہی خوش نصیب تھے کہ انھیں حکومت کرنے کو ملی۔

جب طاقتور شخصیتوں کے مالک یہ دونوں لوگ ایک دوسرے کے سامنے آئے تو شروع ہوا چوہے اور بلّی کا کھیل..... ڈلہوزی، اودھ کے ناکارہ کی طاقت کو کچلنے کے لئے بضد تھا۔ اور واجد علی شاہ محبوب حکمراں ہونے کے رومانی تصورات میں غرق تھے۔ ان کی دریا دلی لوگوں میں مقبول تھی۔ اور عوام کے ساتھ ان کا جو سلوک اور اٹھنا بیٹھنا تھا اس کی وجہ سے وہ انھیں میں سے ایک بن گئے تھے۔

واجد علی شاہ اپنے عالیشان محل کے پھولوں سے آراستہ پھاٹکوں کو اگست کے مہینے میں عام لوگوں کے لیے کھول دیتے تھے جب وہاں ایک بڑا میلہ لگایا جاتا تھا۔ اپنے شاندار شاہی لباس میں ملبوس، اور اسی رنگ کے لباسوں سے آراستہ اپنی چار سو بیویوں کے ساتھ بادشاہ گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھتے۔ وہ سب بچوں اور بوڑھوں کے ساتھ میلے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

ڈلہوزی نے واجد علی شاہ کے خلاف انگلینڈ میں میڈیا بلٹز چلا کر اسے ہرانے کے لئے اپنے پلان میں تیزی لائی۔ اس طرح اس کی مصنوعی اخلاقیات کے جذبات کو کُرید کر معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے لیے عام رائے بنائی گئی۔

ایک انگریز: "بدعنوانی سے حکومت کیے جانے والے ملک پر قبضہ کرنے میں ایک دن کی بھی تاخیر کرنے سے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اچھے ہندوستانیوں کی مصیبت میں ایک دن کا اضافہ اور ہو جائے گا۔"

اس سے ڈائرکٹروں کی عدالت کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انھوں نے نومبر ۱۸۵۵ء میں شہنشاہ کی اجازت کے ساتھ یا اس کے بغیر ہی اودھ پر قبضہ کرنے کیلئے ڈلہوزی کو پورا اختیار دے دیا۔ واجد علی شاہ صرف نام کے بادشاہ رہ جانے پر بہت رنجیدہ ہوئے اور بہت ہی ناامیدی اور مایوسی کے عالم میں انھوں نے اپنا تخت چھوڑا۔ اس بات سے انھیں اتنا صدمہ پہونچا کہ انھوں نے انگریزوں کے ذریعہ دی گئی پنشن کو لینے سے انکار کر دیا۔

۱۳ر فروری ۱۸۵۶ء کو سرکاری طور پر برطانیہ نے اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اور واجد علی شاہ کو کلکتہ میں جلاوطن کر دیا گیا۔

دوستو! شاد رہو تم کو خدا کو سونپا
ہم نے اپنے دلِ نازک کو جفا کو سونپا
قیصری باغ جو ہے اس کو صبا کو سونپا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یہ قدآور شخصیت اپنے پیارے شہر سے دُور چلی گئی لیکن اس کی یادیں اور جذبات لوگوں کے ذہن پر چھائے رہے اور اس کی کمی لوگوں کو بہت کھلتی رہی۔ .... وہ مٹیا برج میں قید کی زندگی گزار رہا تھا اُس کی داستانیں یہاں پروان چڑھ رہی تھیں ...... اسے نہیں بلکہ اس کی داستانوں کو لوگوں کے دلوں سے جلاوطن کیا جانا چاہئے تھا!

.... یہی کام آگے کرنا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد اسی کا بالواسطہ انجام تھی۔ یہ سابق بادشاہ کی عالی شان سخاوت ہی تھی جس سے لوگ یکجا ہوئے، اور ۱۸۵۷ء کی جنگ کی شدت جتنی زیادہ اودھ میں تھی اتنی ملک کے کسی اور حصے میں نہ تھی۔ اُدھر مٹیا برج میں واجد علی شاہ اپنی مصیبت کے دن گزار رہے تھے اور ادھر لکھنؤ میں ان کا قیصر باغ انگریزوں سے ہو رہی جنگ میں گیارہ مہینے تک اپنی رانی بیگم حضرت محل کے پرچم تلے ایک مضبوط قلعہ ثابت ہو رہا تھا۔ واجد علی شاہ کے دل میں اٹھ رہے جذبات اور اس کا المیہ اتنا ہی دردناک تھا جتنا کہ لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ۔

جب اس کی محبوب زمین پر جنگ جاری تھی تب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے درمیان بہت ہی جذباتی خط و کتابت ہوئی۔ ایک لاعلاج بیماری کی تکلیفوں کے مترادف انھوں نے خود کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ ان کے المیہ جذبات کا اظہار ان کے چھپے ہوئے خطوط کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ بادشاہ کی جلاوطنی کے نو سال بہت ہی تکلیف دہ گزرے ان نو سال کے عرصہ کو دو طرح سے قلم بند کیا گیا۔ ایک کا تذکرہ ایلنس آف برٹش ریکارڈس اینڈ سیلمن جرنل میں ملتا ہے اور دوسرے کا ذکر واجد علی شاہ کے سوونیئر میں ملتا ہے۔

شاہی کرنے پر نو سال کا یہ عرصہ زیادہ اہم اور یادگاری لگتا ہے بہ نسبت اس کے بعد کے نوّے سال تک چلنے والی برطانوی حکومت کے، جس میں نوکر شاہی کو فروغ دیا گیا، نئے لوگوں کو خطاب دیئے گئے اور ان لوگوں کو بھلا دیا گیا جو جلاوطن بادشاہ کے وفادار تھے اور جنھوں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ مہاراج جے گوپال ثاقب، منصر الدولہ، مہاراج دھیرج بال کرشن بہادر لال اور کئی دوسرے راجاؤں کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا جو اپنے بادشاہ کے تئیں وفادار تھے۔

شہر بھر ایک مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک نئی تہذیب کی شروعات ہو رہی تھی۔ شہری منصوبے اور تعمیرات نئے طریقوں اور نئی پالیسیوں کے مطابق تھیں۔ واجد علی شاہ کے خوابوں کا حسین شہر اب کالونیز کے شہر کا روپ اختیار کر رہا تھا۔ ان کا قیصر باغ کا محل انگریزوں کے عتاب کا پہلا نشانہ بنا۔ اسے گرا دینے کا حکم دیا گیا۔

"یہیں سے دشمنوں نے جنگ شروع کی اور یہیں سے انھوں نے ہمارے خلاف زبان جاری کیے۔"

قیصر باغ محل کو دیکھتے ہی ان کا خون کھولنے لگتا تھا۔ جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انھوں نے آرٹ اور خوابوں کی اس دنیا میں سڑکیں وغیرہ بنوانا شروع کر دیں ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
وہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

—— (غالب)

مرزا غالب نے بغاوت اور اس کے بعد کے حادثات کو قلم بند کیا ہے اور اس وقت ملک کے جو درد بھرے حالات تھے ان کا ذکر کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اودھ کی تباہی پر اگر آپ کے آنسو نہیں نکلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا دل پتھر کا ہے۔"

اسی طرح کے تکلیف دہ اور درد بھرے حالات سے مٹیا برج بھی دوچار تھا، وہاں واجد علی شاہ کی موجودگی سے المیہ شاعری کا ایک نیا ماحول پیدا ہوا وہاں آرٹسٹوں کا ایک پورا گروپ تھا جو اپنے ماضی کی شان و شوکت کے سہارے زندگی گزار رہا تھا اور انھیں یہ امید تھی کہ وہ ایک دن لکھنؤ واپس جائیں گے۔ ایک بوڑھے ہوتے بادشاہ کی یادوں کی دنیا! وہاں پردہ سب کچھ تھا جو کہ 'بلبل' اور 'قفس' کے شاعرانہ خیالات کو پورا کرتا تھا۔ لکھنؤ سے آنے والا ہر مہمان خوشی کا باعث ہوتا تھا۔

جاڑوں کی ایک صبح، مٹیا برج میں ایک بگھی آتی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے پیدا ہونے والی آواز سے لوگوں کا تجسس بڑھ جاتا ہے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا لکھنؤ سے پیام لاتا ہے۔ یہ مٹیا برج میں قید لوگوں کے لیے اُمید افزا پیام لاتا ہے۔

جو سُریلی آواز میں گایا جانے والا دادرا برآمدوں میں گونج رہا ہے اور اسی وقت لوگوں کا ایک گروپ بڑے ہال کے اندر آتا ہے۔ یہ منظر اودھ کی سابقہ شان و شوکت کی یاد دلاتا ہے۔

ان لوگوں کے بڑھتے ہی بادشاہ اندر آتے ہیں۔ اپنے پُرانے دربار سے آئے دوستوں کو دیکھ کر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ ماحول بہت ہی جذباتی ہو جاتا ہے..... آنکھوں میں آنسو لیے لوگ انھیں بتاتے ہیں کہ لکھنؤ اب ویسا نہیں رہا۔ لوگوں کی آنکھیں ان سبھی خوبصورت

لمحوں کو تلاش کر رہی ہیں جنھیں بادشاہ نے موسیقی اور رقص وغیرہ سے بنایا تھا۔ لوگوں کی زندگی ویران ہو جاتی ہے۔ ان کی آنکھیں بادشاہ سلامت کو خود رقص کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ سبھی وہ سب کچھ پانا چاہتے تھے جسے انھوں نے ماضی میں گنوا دیا تھا۔ بادشاہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب وہ بوڑھا اور بھدّا ہو چلا ہے.... وقت نے ساتھ نہیں دیا لیکن وہ لوگ اتنے بضد تھے کہ بادشاہ کو ان کی خواہش کا احترام کرنا پڑا۔

تمام انتظامات کیے گئے...... فرش پر سُرخ رنگ کی چادر بچھائی گئی اور پھر اس کے اوپر سفید چاندنی۔ موسیقار اور گلوکار اکٹھے ہوئے اور جیسے ہی بادشاہ رقص کرنے کے لئے کھڑا ہوا ٹھمری کی سُریلی آواز گونجنے لگی۔ گھنگھروؤں کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بہت ہی ماہر موسیقار کوئی ساز بجا رہا ہو۔ اور آرٹسٹک تاریخ کا ایک کھلا پنّا سامنے آگیا۔ تیز دُھن میں بجنے والے طبلے کی لَے پر بادشاہ ایک خوبرو رقاص بن گیا۔ لوگ سحر زدہ ہو گئے۔ یہ دیکھ کر کہ بادشاہ کی عمر اور موٹاپا بھی ان کے دلکش آرٹ کو چھپا نہ سکا۔

دھیرے دھیرے رقص اپنے عروج پر پہونچ رہا تھا۔ کچھ لمحوں بعد بادشاہ ناچتے ناچتے گر پڑا۔ اس کی سانس پھُول رہی تھی —— اس نے چاندنی کو آہستہ سے ہٹانے کو کہا۔ اس کے پیروں سے سُرخ چادر پر بانسری بجاتے ہوئے بھگوان کرشن کی تصویر بن گئی تھی۔!! بانسری کی آواز ہال میں گونج رہی تھی..... اور سبھی لوگ مبہوت ہو کر واہ واہ کر رہے تھے۔

□□

ترجمہ:- نرگس خورشید

ڈی ۲۰۰ - اندرا نگر، لکھنؤ

شہرِ نگاراں

یہ لکھنؤ کہ جسے شہرِ آرزو کہیے
یہ لکھنؤ کہ جسے شہرِ آبرو کہیے
یہ رنگ و نور میں ڈوبا ہوا شباب کا شہر
متاعِ بربط و نے، نغمہ و رباب کا شہر
یہی تو شہر ہے بانکوں کا اور جیالوں کا
یہی تو شہر ہے کافر ادا غزالوں کا
اسی کو سمجھیے خوابوں کا شہر کہتے ہیں
اسی کو لوگ نوابوں کا شہر کہتے ہیں
یہ لکھنؤ کہ دبیر و انیس کا ہے وطن
یہیں تو اہلِ سخن کو ملی ہے دادِ سخن
صفی یگانہ و ثاقب کا اور شرر کا وطن
عزیز و آرزو، چکبست اور اثر کا وطن
یہی ہے سالک و اسلم کا اور سراج کا شہر
یہی ہے شعلہ و شبنم کے امتزاج کا شہر
یہیں جنابِ خرد کو ملی فضیلتِ فن
یہیں ہے حضرتِ بیکاں کی آرزو کا چمن
یہیں نسیم نہایت ادب سے چلتی ہے
یہیں حیات نئے پیکروں میں ڈھلتی ہے
زمانے بھر میں ہے مشہور لکھنوی تہذیب
یہاں پہ شیر و شکر رہتے ہیں امیر و غریب
یہاں کی شام کو شامِ اودھ کا نام ملا
سحر ہوئی تو ہر اک آدمی کو کام ملا
یہ رومی گیٹ جسے "بابِ لکھنؤ" کہیے
اماماباڑہ نہیں خوابِ لکھنؤ کہیے
یہی دیار تو یوپی کی راجدھانی ہے
یہاں کی بولی کی ہر سمت حکمرانی ہے
یہ لکھنؤ تو مرے خواب کی امانت ہے
یہ لکھنؤ جو حقیقت میں ایک جنت ہے

بیکل جعفری اترولوی
ڈی / ۲۸۰، ارزانی لے کالونی، عیش باغ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴

۱- [illegible]

سید احمد حسن رضوی
مرشد آباد ہاؤس ۔ منصور نگر لکھنؤ

لکھنؤ کی تاریخی عمارتیں

نوابینِ اودھ نے اپنے دورِ حکومت میں یہاں کلچر، تہذیب اور فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں نئی قدروں کو وسعت دی، وہیں فنِ عمارت میں بھی ایک نیا طرز اختیار کیا اور ایسی عمارتیں تعمیر کرائیں جو فن کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہ عمارتیں نہ تو مغلیہ عمارتوں کی نقل ہیں اور نہ ہی قدیم ہندستانی عمارتوں جیسی ہیں۔ یہاں کی عمارتیں ہندستانی ایرانی اور ترکی طرز کی عمارتوں کے فن کو شامل کر کے بنوائی گئی ہیں۔ یہ عمارتیں بعض طرح میں مغل عمارتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں لیکن خوبصورتی اور نزاکت و نفاست میں اپنی ایک منفرد حیثیت کی مالک ہیں۔ مثال کے طور پر آصفی امامباڑے کو لیجیے جو بھاری بھرکم ایک عظیم عمارت ہوتے ہوئے بھول بھلیوں، دالانوں، محرابوں اور نقش و نگار کی وجہ سے دنیا میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی۔

شروع کے نوابین نے اپنی جنگی مصروفیات کی وجہ سے محض قلعے، گڑھیاں، کنوئیں وغیرہ ہی حسبِ ضرورت بنوائے ہیں جو فنی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن نواب آصف الدولہ کے زمانے میں دیگر قسم کی عمارتیں مثلاً محلات، ڈیوڑھیاں، امامباڑے، سرائے اور چوک بازار وغیرہ بننا شروع ہوئے۔ آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خاں تختِ حکومت پر بیٹھے۔ انھیں کئی سال کلکتہ میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا اس زمانے میں کلکتہ میں انگلینڈ کے طرز کی عمارتیں بننے لگی تھیں۔ یہ عمارتیں چھوٹی اور دیکھنے میں ہلکی پھلکی لگتی تھیں۔ چونکہ نوابینِ اودھ میں جدت پسندی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا اس لیے نواب سعادت علی خاں اور ان کے متاخرین نے انگریزی طرز کی عمارتیں بنوانے کی طرف خاص طور سے توجہ دی۔

اودھ کا نوابی دور فیض آباد سے شروع ہوتا ہے جہاں نواب سعادت خاں برہان الملک، نواب صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ نے ایک نئے ثقافتی مرکز کی بنا ڈالی۔ ابتدائی دور کے دونوں حکمرانوں کو تو سیاسی اور فوجی استحکام ہی پر توجہ دینی پڑی البتہ نواب شجاع الدولہ نے اپنے گیارہ سالہ قیام فیض آباد میں قلعوں وغیرہ کے علاوہ چوک بازار قائم کیے جس کے چار دروازے یکدرہ کے نام سے اب بھی موجود ہیں۔ یہ بہت مضبوط اور وسیع عمارتیں ہیں۔ تین تین در ہیں جن کے اندر سے سواریاں گزرتی رہتی ہیں۔

نواب شجاع الدولہ کے بعد جب نواب آصف الدولہ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو سکونت لکھنؤ میں اختیار کی اور یہاں عمارتیں بنوانے لگے۔ بعد کے نوابین اور بادشاہوں نے بھی اپنے مزاج کے مطابق عمارتیں تیار کرائیں۔ یہاں پر چند عمارتوں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے:

آصفی امامباڑہ

اس کو بڑا امامباڑہ بھی کہتے ہیں اور اس نام سے یہ زیادہ مشہور ہے۔ یہ اودھ یا لکھنؤ کی سب سے اہم اور مخصوص عمارت ہے جس کو ۱۷۸۴ء میں قحط کے زمانے میں نواب آصف الدولہ نے بنوانے کی ابتدا کی اور جو ۱۷۹۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس وسیع و عریض عمارت کے معمار کفایت اللہ تھے۔ امامباڑے کی عمارت پانچ حصوں پر مشتمل ہے جن میں تین دالان، ایک ہشت پہل ہال اور ایک مربع ہال ہے۔ امامباڑے کے سامنے ملحق ایک وسیع و عریض چبوترہ ہے۔ دالانوں میں سے درمیانی دالان ۱۶۳ فٹ لمبا، ۵۳ فٹ چوڑا اور ۴۹½ فٹ اونچا ہے۔ دیواروں کی چوڑائی ۱۶ فٹ ہے۔ مشرق میں ہشت پہل ہال ہے جس کا قطر ۲۱۶ فٹ اور اونچائی ۵۲ فٹ ہے۔ مغرب کی جانب جو ہال ہے اس کی لمبائی چوڑائی ۵۴ فٹ اور اونچائی وہی ۵۳ فٹ ہے۔ دیواروں کی چوڑائی دونوں ہال کی ۱۶ فٹ ہے۔ امامباڑہ کے سامنے ایک مربع سبزہ زار ہے جس کے مغربی

حصہ میں بلند چبوترے پر مسجد ہے اور مشرق کی جانب باولی ہے جو بذات خود کئی منزلہ عمارت ہے ۔ اس کے علاوہ دو جلوخانے، نوبت خانہ اور ایک باغ بھی موجود ہے۔

امامباڑہ کے باہر رومی دروازہ نام کی ایک پانچ منزلہ عمارت ہے جو اپنی بلندی، مضبوطی اور عظمت کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ اس عمارت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ پوری عمارت ایک محراب پر قائم ہے۔

امام باڑہ اور اس سے ملحق عمارتوں میں لوہا یا لکڑی کا استعمال کہیں نہیں کیا گیا ہے۔

نواب آصف الدولہ جب فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو یہاں حسین آباد میں موجودہ گھنٹہ گھر کے شمال میں کئی عمارتیں تعمیر کروائیں جو دولت خانہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ جس حصہ میں وہ خود سکونت پذیر تھے اس کا نام آصفی کوٹھی تھا۔

دلکشا گارڈن

اس محل کی عمارت نواب سعادت علی خاں نے بنوائی تھی جو شکستہ حالت میں اب بھی موجود ہے۔ یہ ایک وسیع میدان میں واقع تھی جس میں سیکڑوں جانور مثل ہرن وغیرہ کے پائے جاتے تھے اور جو ان کی شکار گاہ بھی تھی۔ اس عمارت اور باغ کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شدید نقصان پہونچا۔

بیبا پور کوٹھی

دلکشا گارڈن کے مشرقی جانب اس عمارت کے منہدم شدہ حصے اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس عمارت کو نواب آصف الدولہ کے لئے جنرل مارٹن نے تعمیر کیا تھا۔ یہ انگریز ریزیڈنٹ کی قیام گاہ بھی تھی۔ نواب وزیر علی کی معزولی کے احکام اسی کوٹھی سے جاری ہوئے تھے۔

دلکشا سے قریب ہی بادشاہ نصیر الدین حیدر کا تعمیر کیا ہوا ولایتی باغ بھی اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور تھا۔ لیکن اب اس کے صرف نشانات باقی ہیں۔

لا مارٹینیر

یہ ایک بڑی، شاندار اور مستحکم عمارت ہے جسے دور آصف الدولہ میں جنرل کلاڈ مارٹن نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ آصف الدولہ اس عمارت کو خرید لیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس عمارت میں مارٹن نے توپ بنانے کا ایک کارخانہ بھی قائم کیا تھا جس میں بنی ہوئی ایک توپ ٹیپو سلطان کے خلاف ۱۷۹۲ء میں انگریزوں نے استعمال کی تھی۔

مارٹن کی وصیت کے مطابق اس کی موت کے بعد ایک اسکول قائم کیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔ یہی عمارت اس کا مدفن بھی ہے۔ اسی جگہ میجر ہڈسن بھی مدفون ہے جو دہلی کے شہزادوں کا قاتل تھا۔

خورشید منزل

اس عمارت کی تعمیر کی ابتدا نواب سعادت علی خاں نے کی تھی جس کی تکمیل ان کے بیٹے بادشاہ غازی الدین حیدر نے کی۔ یہ عمارت نواب کی بیگم خورشید زادی کے نام سے منسوب ہے۔ اس عمارت میں اب لا مارٹینیر گرلز اسکول قائم ہے

موتی محل

یہ ایک بڑے وسیع و عریض باغ میں تعمیر شدہ تین عمارتوں پر مشتمل ہے۔ خاص موتی محل کو نواب سعادت علی خاں نے بنوایا تھا۔ اس کے ملحق دریا کے کنارے دو عمارتیں مبارک منزل اور شاہ منزل کو نواب غازی الدین حیدر نے تعمیر کرایا تھا۔ اسی سے قریب وہ میدان ہے جہاں جنگلی جانور لڑائے جاتے تھے اور جس کا نظارہ شاہ منزل سے کیا جاتا تھا۔

کوٹھی حیات بخش

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے دور میں تعمیر ہوئی۔ ابتدا میں یہاں کلاڈ مارٹن نے بارود بنانے کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے قاتل میجر ہڈسن کا انتقال اسی کوٹھی میں ہوا تھا۔

یہ آج کل گورنر اترپردیش کی رہائش گاہ ہے۔

کوٹھی فرحت بخش

یہ محل کلاڈ مارٹن نے بنوایا تھا اور وہ خود اسی میں رہتا تھا۔ بعد میں اس کو نواب سعادت علی خاں نے پچاس ہزار روپے میں خرید لیا۔ اس وقت سے نواب واجد علی شاہ سے قبل کے سبھی نوابین اسی

محل میں یا اس سے متصل عمارتوں میں قیام کرتے تھے۔ بعد میں اسی جگہ پر واجد علی شاہ نے اپنے محلات تعمیر کرائے۔

موسیٰ باغ

شہر کے شمال مغرب میں نواب سعادت علی خاں نے ایک بہت بڑا باغ تعمیر کرایا تھا۔ اس عمارت کی تعمیر میں بھی مارٹن کا ہاتھ تھا عمارت کے مقابل دریا کے کنارے کا میدان شکارگاہ اور جنگلی جانوروں کو لڑانے کے کام آتا تھا۔ اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔

ریزیڈنسی

یہ بہت سی عمارتوں کا مجموعہ ہے جس میں انگریز ریزیڈنٹ رہتا بھی تھا اور اس کے دفاتر وغیرہ بھی قائم تھے۔ اصل عمارت نواب سعادت علی خاں نے تعمیر کرائی تھی جس میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان میں سے ایک عمارت بیگم کوٹھی کے نام سے مشہور تھی جس میں بادشاہ نصیر الدین حیدر کی انگریز بیگم رہا کرتی تھیں اور جنھوں نے مسجد اور امام باڑہ کا اضافہ کروایا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان عمارات کو شدید نقصان پہونچا۔ کھنڈرات محفوظ ہیں۔

لوہے کا پل

نواب سعادت علی خاں نے ایک لوہے کا پُل دریائے گومتی پر قائم کرنے کی غرض سے سامان انگلینڈ سے منگوایا تھا جس میں تین محرابیں تھیں۔ درمیانی محراب ۹۰ فٹ چوڑی اور دوسری محرابیں ۸۰ فٹ چوڑی تھیں۔ اونچائی ساٹھ فٹ تھی۔ تقریباً چالیس سال یونہی پڑا رہا۔ عہد امجد علی شاہ میں ریزیڈنسی کے مقابل دریا پر قائم کیا گیا۔ لوہے کے پل کے ڈھانچے کی لاگت کے علاوہ اس کو قائم کرنے میں ایک لاکھ اسی ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے سیلاب میں منہدم ہوگیا۔

امام باڑہ حسین آباد

یہ چھوٹا امام باڑہ کے نام سے بھی مشہور ہے جو اپنی سجاوٹ اور صفائی کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے اسے نواب محمد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ امام باڑہ کے سامنے کھلے میدان میں بہت لمبا حوض ہے مغربی حصہ میں آگرہ کے تاج محل کی نقل کا مقبرہ بنا ہے جس میں بادشاہ کی بیٹی دفن ہیں۔ مشرقی جانب اسی مشابہت کی دوسری عمارت ہے۔ اسی احاطہ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی ہے۔ عمارت کے باہری حصے میں نوبت خانہ، کنواں اور سہ درہ پھاٹک وغیرہ بنے ہیں۔ محرم کے دوران روشنی کا خاص انتظام کیا جاتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ محمد علی شاہ نے جامع مسجد، ست کھنڈہ، تالاب اور دیگر عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔

لال بارہ دری

یہ عمارت موجودہ ہائی کورٹ کی عمارت اور چھتر منزل کے درمیان واقع ہے۔ اسے نواب سعادت علی خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کو قصر السلطان نام دیا گیا۔ یہاں پر نوابین کی تاجپوشی اور شاہی دربار ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مرزا رفیع الدین عرف مُنّا جان کی تاجپوشی انگریزوں کی مرضی کے خلاف اسی بارہ دری میں ہوئی تھی۔ منّا جان کی دادی اور بادشاہ غازی الدین حیدر کی بیوہ بادشاہ بیگم کی فوجوں کے درمیان اس مسئلہ پر جنگ ہوگئی۔ بارہ دری کے اندر بہت سے لوگ مارے گئے۔ بادشاہ بیگم کے سپاہ کا فرار ہونے پر مجبور ہوگئے۔ بادشاہ بیگم اور منّا جان قید کر لیے گئے اور شہزادہ نصیر الدولہ محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔

بعد میں انگریزوں نے یہاں لائبریری قائم کی۔ کچھ عرصہ بعد یہیں پر میوزیم (مردہ عجائب گھر) قائم ہوا، جواب زندہ عجائب گھر کے احاطے میں ہے آج کل یہاں تصویروں کی نمائش ہوا کرتی ہے۔

چھتر منزل کی عمارتیں

نوابین کے عہد میں ان عمارتوں کا سلسلہ موجودہ صدر ڈاک خانہ کی عمارت سے لے کر بیلی گارد ریزیڈنسی تک پھیلا ہوا تھا۔ ان میں بڑی چھتر منزل اور چھوٹی منزل اور چھوٹی چھتر منزل اہم ہیں۔ بڑی چھتر منزل میں انگریزوں نے ایک کلب قائم کیا تھا۔ آزادی کے بعد سے اب اس عمارت میں سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ چھوٹی چھتر منزل میں مختلف دفاتر تھے یہ عمارت منہدم ہوچکی ہے۔ اس جگہ پر کمشنر لکھنؤ کا دفتر تعمیر ہوا ہے۔ اس عمارت کی پشت پر جو شاہی عمارت ہے اس کا نام درشن بلاس ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں گلستان ارم کی عمارت ہے۔ کوٹھی فرحت بخش جس کا ذکر بیشتر کیا جاچکا ہے۔ انھیں عمارتوں کے مجموعہ میں شامل تھی۔

مقبرہ سعادت علی خاں

قیصر باغ سے ملحق دو مقبرے بنے ہوئے ہیں یہ نواب سعادت علی خاں اور ان کی بیگم خورشید زادی کی آرام گاہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان مقبروں کی تعمیر سے قبل اس جگہ جو عمارت تھی وہ نواب سعادت علی خاں کی رہائش گاہ تھی۔ ان کے انتقال کے بعد جب ان کے بیٹے نواب غازی الدین حیدر بادشاہ ہوئے تو انھوں نے کہا کہ چوں کہ اب مسند حکومت پر باپ کی جگہ لی ہے اس لیے اس کے عوض وہ اپنی رہائش گاہ اپنے باپ کو سونپ دیں گے چنانچہ اپنے محل کو منہدم کروا کے انھوں نے یہ مقبرے تعمیر کروائے جو کہ اب بھی لوگوں کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔

بیگم کوٹھی

یہ عمارت موجودہ دارالشفا کی عمارت کے شمال میں بادشاہ امجد علی شاہ نے اپنی بیگم ملکہ احد کی رہائش کے لیے تعمیر کرائی تھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی یہاں بھی لڑی گئی تھی۔ انگریزوں کے دور میں یہاں صدر ڈاک خانہ قائم تھا۔ بعد میں جب موجودہ عمارت میں صدر ڈاک خانہ منتقل ہو گیا تو یہاں دیگر سرکاری دفاتر کام کرنے لگے۔ ہیم وتی نندن بہوگنا جب وزیر اعلا ہوئے تو اس عمارت کو منہدم کرا کے نئی عمارت تعمیر کرائی گئی جس میں دفاتر کے علاوہ بہت بڑا بازار جن پتھ کے نام سے مشہور ہے۔

شاہ نجف

دریائے گومتی کے کنارے موتی محل کے پاس اس مقبرہ کی تعمیر نواب غازی الدین نے کرائی۔ یہ عمارت عراق میں واقع حضرت علیؑ کے روضہ کی ہو بہو نقل ہے۔ اسی لیے اس کو نجف اشرف بھی کہتے ہیں۔ اس کا گنبد اور سجاوٹ قابل دید ہے۔ یہاں کئی موقعوں پر مذہبی محافل و مجالس ہوتی رہتی ہیں۔

تاراوالی کوٹھی

اس کوٹھی کی نواب نصیر الدین حیدر نے تعمیر کرائی اور اس میں رصد گاہ قائم کی۔

اس زمانہ کے ماہر فلکیات کرنل ول کاکس اس کے نگراں تھے۔ دور واجد علی شاہ میں جب ان کا انتقال ہو گیا تو یہ محکمہ بھی بند ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ نے اس کو اپنا مستقر بنا لیا تھا آج کل اس عمارت میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا کا صدر دفتر ہے۔

بادشاہ باغ

یہ ایک بہت وسیع باغ تھا جس کو بادشاہ نصیر الدین حیدر نے تعمیر کرایا تھا۔ بیچ باغ میں پتھر کی خوبصورت عمارت تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ عمارت مہاراجہ کپور تھلہ کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں کل آراضی نوے ایکڑ رقبہ کی کیننگ کالج کو کالج، ہوسٹل اور کوارٹر وغیرہ کی تعمیر کے لئے دے دی گئی۔ ۱۹۰۸ء میں ہوسٹل تعمیر ہوا اور ۳۱ اگست ۱۹۰۹ء کو کالج کا سنگ بنیاد ہیوٹ گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا۔ ۱۷ فروری ۱۹۱۱ء کو کالج کھل گیا۔ اب یہ کالج لکھنؤ یونیورسٹی کی شکل میں ایک بہت بڑی تعلیم گاہ ہے۔

قیصر باغ کے محلات

نواب واجد علی شاہ نے قیصر باغ کے نواح میں بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں تھیں۔ کچھ عمارتیں مثلاً چاندوالی کوٹھی، چینی باغ یا چینی محل، جلو خانہ اور حضرت محل وغیرہ چہار دیواری کے باہر تھیں۔ چہار دیواری کے اندر درمیان میں سفید بارہ دری ہے۔ چاروں طرف کی عمارتوں میں بیگمات رہتی تھیں۔ اس میں چار صدر دروازے تھے جن میں صرف دو باقی رہ گئے ہیں۔ یہ لکھی دروازہ یا لکھی گیٹ کہلاتے تھے۔ شمالی حصہ میں جو عمارت ہے اس میں پتھروں کا عجائب گھر ہے۔ اس سے قبل اس عمارت میں موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی کیننگ کالج کے نام سے قائم تھی۔

سکندر باغ

اس وسیع و خوبصورت باغ کو نواب واجد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں باغ کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ صدر گیٹ اور کہیں کہیں چہار دیواری باقی ہیں۔ آزادی کے بعد ایک نیا باغ نیشنل بوٹانیکل گارڈن کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔

عالم باغ

یہ باغ نواب واجد علی شاہ نے ایک بہت بڑے رقبے میں تعمیر کرایا تھا۔ درمیان میں ایک محل بھی بنوایا تھا۔ کانپور روڈ پر صدر پھاٹک کی عمارت ابھی قائم ہے۔ اندر تھوڑی دور پر محل کی عمارت شکستہ ہو چکی ہے۔ اس محل میں نواب واجد علی شاہ کی بیگم نواب خاص محل

عالم آرا بیگم رہا کرتی تھیں جو ولی عہد بہادر نواب حامد علی خاں کی والدہ تھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں انگریزوں اور ہندستانیوں میں جم کر لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں عمارت کو شدید نقصان پہونچا۔ ولی عہد بہادر نواب حامد علی خاں کے پوتے پرنس سلطان حسن مرزا صاحب حسین آباد اور شاہ نجف کے متولی تھے۔ ان کی بیٹی شہزادی سلطان قمر آرا بیگم صاحبہ باحیات ہیں اور گولہ گنج میں قیام پذیر ہیں۔

دیگر باغات شہر لکھنؤ باغات کا شہر کہلاتا ہے۔ یہاں کے نوابین کو باغات کی تعمیر کا بڑا شوق تھا۔ عالم باغ اور سکندر باغ کے علاوہ ڈالی باغ، چار باغ، عیش باغ، موسم باغ، بادشاہ باغ، باغ شیر جنگ، موتی باغ جھاؤ لال باغ، منور باغ، وزیر باغ وغیرہ بے شمار باغ تھے جو اب باقی نہیں رہے لیکن ان کے نام کے محلے اب بھی آباد و مشہور ہیں۔

فیض آباد کی عمارتیں

مقبرہ بہو بیگم نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ نے تو اپنا قیام لکھنؤ میں رکھا لیکن ان کی والدہ امۃ الزہرا صاحبہ جو بہو بیگم کے نام سے مشہور ہیں، وہیں فیض آباد ہی میں رہیں۔ ان کے انتقال پر ایک بلند و پرشکوہ مقبرہ تعمیر ہوا۔ یہ عمارت اس قدر خوبصورت اور دلکش ہے کہ "اودھ کا تاج محل" کے نام سے مشہور ہے۔

مقبرہ شجاع الدولہ فیض آباد کی مشہور عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو گلاب باڑی بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس کی افتادہ آراضی پر گلاب کا باغ سجایا گیا ہے۔ یہاں کے گلاب کے پھول دور دور تک مشہور ہیں۔

○○

شانِ حق

شاہِ کربلا تو نے شانِ حق بڑھا دی ہے
تو نے ہم کو ایماں کی روشنی دکھا دی ہے

شمعِ حق نہ گُل ہوگی آندھیاں ہزار آئیں
شاہِ بیکس و تنہا تو نے وہ ضیا دی ہے

اب کبھی نہ بگڑے گی بات دینِ احمدؐ کی
حق کی آبرو شہؑ نے اس طرح بڑھا دی ہے

دیں کے واسطے اپنا گھر لٹا کے سرورؑ نے
جادۂ صداقت کی راہ جگمگا دی ہے

بھر کے دامنِ امید تیرے در سے وہ آیا
جس نے بھی مرے مولا آپ کو صدا دی ہے

لے کے جائیں گے ہم بھی شہؑ کے آستانے سے
اب جبیں وصیہ نے اس طرح جھکا دی ہے

——— فاطمہ وصیہ جائسی

۳۰، ساتویں گلی۔ نشاط گنج لکھنؤ

"مجھے یاد ہے ۱۹۳۶ء کی ایک شام مجاز رشید جہاں کے گھر پر اپنی کوئی نظم (ترنم میں) سُنا رہا تھا۔ محمود الظفر، شوکت عمر اور خواجہ منظور حسین بھی وہاں تھے، دو بچیاں بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بچی نے کچھ کہا تو دوسری نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا: چُپ رہو باجا بج رہا ہے۔" ——— سردار جعفری

اودھ نمبر

تاثرات کے آئینے میں

نیا دور کا اودھ نمبر ملا، بالاستیعاب دیکھا، بتا نہیں سکتا کس قدر خوشی ہوئی۔ آدمی ٹھان لے اور جی پر رکھ لے تو کیا نہیں ہوسکتا۔ آپ نے پرانے دنوں کی یاد تازہ کردی اور سب سے لکھوایا۔ یہ آسان نہیں۔ اودھ نمبر کی حیثیت دستاویزی ہے۔ یہ بہت اچھا اور اہم کام ہوگیا۔ یقین ہے کہ آئندہ بھی آپ محنت میں کمی نہ آنے دیں گے۔

—— (پروفیسر) گوپی چند نارنگ دہلی

"اودھ نمبر" موصول ہوا۔ رشک آیا کہ اس نمبر کے مضمون نگاروں میں میں کیوں شامل نہیں۔ آپ نے تو کئی بار یاد دہانی کرائی، مگر میں ہی بوجوہ مضمون نہ لکھ سکا۔

اس خوبصورت اور بھرپور نمبر پر آپ کو دلی مبارکباد۔ شاد باشید۔

—— کالی داس گپتا رضا
بمبئی

نیادور کا اودھ نمبر ملا۔ سیر ہو کر پڑھا پھر بھی سیری نہیں ہوئی۔ آپ نے اودھ کی تہذیب کے تمام نمایاں گوشوں کا احاطہ کرنے والے مضامین شائع کیے ہیں۔ آج ہی یہ نمبر جلد سازی کے لئے دے دیا ہے کیوں کہ یہ نمبر محفوظ کیے جانے اور وقتاً فوقتاً ضروری حوالوں کے لیے استعمال کرنے کے قابل ہے۔ آپ نے جب سے نیادور کی ادارت سنبھالی ہے تب سے نیادور واقعی نیادور بن گیا ہے۔ کاظم علی خاں: (اودھ میں اردو شاعروں کی آخری آرام گاہیں)، لیئق اختر فیض آبادی: (فیض آباد کی تہذیبی روایات)، محمد اسحٰق صدیقی: (لکھنؤ کے امامباڑے)، ڈاکٹر نیر مسعود: (لکھنؤ کی یادگار مجلسیں) اور عرفان عباسی: (چند شاعرات اودھ۔ اجمالی تذکرے) کے مضامین اس خاص نمبر کی جان ہیں، دل ہیں، نفس ہیں، باطن ہیں۔ حسن واصف عثمانی میرے دیرینہ رفیق ہیں، لگ بھگ چالیس سال سے میرے ان سے تعلقات ہیں اور وہ ایک اچھے صحافی بھی ہیں مگر "لکھنؤ کے چند اخبار" کے عنوان سے انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اُسے Comprehensive نہیں کہا جاسکتا۔ اگر صرف ایک صفحہ اور لکھ دیتے تو سلامت علی مہدی کے روزنامہ "ملت"۔ وزارت شکوہ کاشمیری کے "ہمت"۔ فضل لکھنوی کے "نظارہ"۔ ہاشم رضا عابدی کے "شیعہ گزٹ" کے ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کے "قائد" وغیرہ کا بھی احاطہ ہوجاتا۔ پھر بھی "اودھ نمبر" ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ نئے عنوانات شامل کرکے آپ اودھ نمبر حصہ دوم بھی نکالیں گے تاکہ اودھ کے مشہور قصبات، وہاں کی عالی شان تعمیرات اور عظیم ہستیوں کا بھی ذکر ہوجائے۔

—— پروانہ رُدَولوی۔ دہلی

"اودھ نمبر ملا۔ کیا شاندار نمبر نکالا ہے۔ میں نے نہایت دلچسپی سے پڑھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی یاد برسوں تک لوگوں کے دلوں میں رہے گی۔

—— دلیپ سنگھ۔ دہلی

نیادور کا "اودھ نمبر" ملا۔ بہت جی خوش ہوا۔ ۱۴۴ صفحات کی اس تہذیبی دستاویز کے تیس مقالوں میں آپ نے تہذیب اودھ کے بہت سے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے۔ اگر اس میں مصوری پر کوئی مضمون شامل نہیں ہوسکا یا شرر کی "گذشتہ لکھنؤ" جیسی تصنیف کے اقتباس نہیں آسکے تو ظاہر ہے کہ شمارے کی طوالت آڑے آگئی۔ لیکن جو کچھ شامل ہوا ہے اس کی حیثیت بھی قاموسی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی۔ کاکوری کے حقائق۔ فرنگی محل کی علمی اور سیاسی خدمات۔ لکھنؤ کی رثائی تہذیب اور نگارشات، اس کے قدیم مدارس، اہم اخبارات، معاشرہ، تہوار، فرماں روا، ممتاز علما، یادگار مجلسیں، شاعرات، ملیح آباد، اور فیض آباد کی روایتیں اور ان سب کے ساتھ اودھ کے نئے جنم کی عکاسی سے اس نمبر کو ایک نادر خزینے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اسکے لیے میری مبارکباد قبول فرمائیں۔

—— گربچن چندن دہلی

نیادور کا اودھ نمبر ملا۔ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ کیوں کہ اس موضوع پر اکا دکا مضمون پڑھا تھا لیکن ایسا ضخیم مواد اسی میں ملا۔ مبارکباد قبول کریں۔ لکھنؤ کی گائیکی لکھنؤ کا کتھک (نوشاد علی)، فرنگی محل کی علمی ادبی

اور سیاسی خدمات (ولی الحق انصاری)، داستانِ امیر حمزہ (گیان چند)، اودھ کا آخری تاجدار (کوکب قدر) اور کاکوری حقائق کی روشنی میں (احمد ابراہیم علوی) مضامین بہت پسند آئے۔ صرف کاظم علی خاں صاحب کا "قبرستان" ایک Discordant note تھا۔ آپ کے اداریہ اور انجم قدر سے انٹرویو دل کش تھے۔ اگر کچھ کاٹ چھانٹ کے کتابی شکل میں شائع کر دیں تو اودھ کی تہذیب کی بہت خدمت ہوگی کیوں کہ یہ تہذیب اودھ تک ہی محدود نہیں رہ گئی، کافی بڑے علاقے میں پھیل گئی ہے۔

——— پرکاش چندر۔ لکھنؤ

نیا دور پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ شکر گزار ہوں۔ ادھر فروری اور مارچ کا مشترکہ شمارہ "اودھ نمبر" ملا۔ ایسا ضخیم، معلوماتی اور شاندار نمبر پیش کرنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد۔

اودھ کے بارے میں جانتا تھا اور بہت کچھ، لیکن اس خصوصی اشاعت کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ اودھ کے بارے میں اور بہت کچھ جاننا باقی تھا۔ اس نمبر نے تو ڈھیر ساری معلومات فراہم کر دیں۔ اودھ کے تعلق سے فنونِ لطیفہ پر تو آپ نے خاص طور پر توجہ دی ہے لیکن علمی، ادبی، سیاسی، صحافتی، تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور کئی پہلوؤں کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔ لکھنے والے تو قابلِ مبارکباد ہیں ہی لیکن بحیثیت مدیر آپ بھی لائق مبارکباد ہیں کہ اتنے زیادہ موضوعات پر اہلِ قلم حضرات سے مقالات حاصل کر سکے۔

یہ نمبر بلاشبہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور پھر جس دیدہ زیب انداز میں آپ نے پیش کیا ہے وہ اور لائقِ تحسین ہے۔

——— سلیمان اطہر جاوید ترد پتی

نیا دور کا "اودھ نمبر" باصرہ نواز ہوا، عنایات کے لئے ممنون و متشکر ہوں۔ "اودھ نمبر" اپنے مواد و مشمولات اور تزئین و آرائش کے لحاظ سے ایک نہایت وقیع اور یادگار ادبی و ثقافتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے نیز اودھ کے جملہ فنونِ لطیفہ کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر مصوری پر بھی کوئی مبسوط مقالہ شامل ہوتا تو نمبر کی افادیت و تکمیلیت کا احساس کچھ سوا ہوتا۔ بہر کیف اس نمبر میں اودھ کے ماضی کی شاندار روایات کی جھلکیاں بھی ہیں اور حال کی جلوہ سامانیاں بھی۔ قومی یک جہتی اور مشترکہ تہذیب کے نمونے ماضی و حال کے آئینوں میں جو سرزمینِ اودھ میں ملتے ہیں، ماضی میں سوائے قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار کے کسی دوسرے علاقے میں نہیں ملتے ظاہر ہے کہ جس موضوع کا آپ نے انتخاب کیا ہے اس کی مختلف جہتوں کی پیش کش "ڈیڑھ سو صفحات میں ممکن بھی نہیں، تقاضا ہے کہ

"کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے"

لیکن آپ کی مدیرانہ بصیرت نے جزو میں کل کو جس نفاست اور سلیقے نیز توازن و تزئین سے سمیٹا ہے یقیناً قابلِ داد ہے۔

اردو کی مختلف اکادمیاں اپنے ذرائع و وسائل کے پیشِ نظر وقتاً فوقتاً ادیبوں اور فن کاروں کی شخصیات اور ان کے کارناموں پر نمبر شائع کرتی رہی ہیں لیکن اس ضمن میں "نیا دور" کی کاوشیں بہ لحاظ مشمولات و مواد اور کیا بہ لحاظ قیمت، سب پر فوقیت رکھتی ہیں۔

——— مشتاق احمد نوری

بہار اردو اکادمی۔ پٹنہ

نیا دور کا "اودھ نمبر" کل کی ڈاک سے موصول ہوا۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سرورق سے صفحہ آخر تک پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑے گا کہ اودھ نمبر یقیناً ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ جس مشاقی اور جانفشانی سے اودھ کی سماجی، سیاسی، ثقافتی حالات کا احاطہ کیا گیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد آپ کے رشحاتِ قلم کا قائل ہونا ہی پڑے گا۔ خصوصاً ادبی لحاظ سے استاد محترم جناب پروفیسر مجاور حسین صاحب کا مضمون "طلسم ہوش ربا میں نسوانی معاشرہ" اردو ادب کے طلباء کے لئے بہت ہی کار آمد ثابت ہوگا۔ لکھنؤ کی شاعرات کے سلسلے میں عرفان عباسی کا مضمون اور ڈاکٹر کاظم علی خاں صاحب کا مضمون "اردو شاعروں کی آخری آرام گاہیں" کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ قومی یکجہتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جہاں لکھنؤ کے امام باڑوں کا تذکرہ ہے وہیں لکھنؤ کے مشہور مندروں کے بارے میں بھی اچھا خاصا مضمون شاملِ اشاعت ہے۔ کُل ملا کر یہ نمبر اپنے آپ میں ایک جامع مرقع ہے جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لہٰذا مبارکباد قبول فرمائیں۔

——— (ڈاکٹر) خورشید ظفر

بمبئی

□□

اترپردیش کے وزیراعلا شری ملائم سنگھ یادو گذشتہ ۲۶ رمئی ۱۹۹۴ء کو رویندرالیہ میں
ضعیفوں، بیواؤں اور معذوروں کی تقسیم پنشن تقریب کی صدارت کرتے ہوئے۔

وزیراعلا
شری ملائم سنگھ یادو
کو
بالمیکی سماج نے
گذشتہ ۳۰ رمئی کو
سہکاریتا بھون
میں
استقبالیہ
دیا۔

Vol. 49 No. 3
June, 1994
Rs. 3.00

Urdu Monthly

NAYADAUR

R.N. 4552/51
Annual Subs.
Rs. 30.00
LW/NP/444/94

POST BOX NO. 146, LUCKNOW-226 001